اقبال کا آخری معرکہ

مولانا حسین احمد دیوبندی کے نظریہ "ملت از وطن است" پر حکیم الامت علامہ اقبال کی تاریخی تنقید اور اس پر علمائے دیوبند کے اعتراضات کا جائزہ

از سید نور محمد قادری

رضا پبلی کیشنز - مین بازار داتا صاحب دربار - لاہور

اقبال کا آخری معرکہ

مولانا حسین احمد دیوبندی کے نظریہ "ملّت از وطن است" پر حکیم الامّت علامہ اقبال
کی تاریخی تنقید اور اس پر علمائے دیوبند کے اعتراضات کا جائزہ

از سیّد نور محمد قادری

رضا پبلی کیشنز - مین بازار داتا صاحب دربار - لاہور

کتاب اقبال کا آخری معرکہ

مؤلف سید نور محمد قادری

تقریب محمود میانوی

مطبع مولا دادا پرنٹرز لاہور

ناشر میاں زبیر احمد قادری ضیائی

تاریخ طباعت یکم فروری ۱۹۷۹ء

تعداد ایک ہزار

پروف ریڈنگ امجد رضا

ملنے کا پتہ

رضا پبلی کیشنز

مین بازار داتا صاحب لاہور

انتساب

برادران گرامی قدر سید گلزار محمد قادری اور سید خلیل احمد بی ۔اے کی طرف یہ اوراق منسوب کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں"

سیّد نور محمد قادری

تقریب

جب برّصغیر میں اسلام کے احیاء و نفاذ کے لئے ایک علٰحدہ اسلامی مملکت کے قیام کا سوال اٹھا، خدا اور رسولِ خدا (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کی روشنی میں زندگیاں گزارنے کے لیے اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لئے کفر و اسلام میں تمیز، اور حق و باطل میں تفاوت کو اجاگر کرنے کا موقع آیا، کفر کی ہر شکل سے نفرت کی رَو چلی اور انگریزوں یا ہندوؤں کو اپنا حاکم تسلیم نہ کرنے کی آواز بلند ہوئی ـــــ تو کچھ لوگوں نے اپنا وزن باطل کے پلڑے میں ڈال دیا، اسلام کے تخصّص اور مسلمانوں کی انفرادیت کو منوانے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیں، خدا اور محبوبِ خدا کے انکار و اقرار کو "ایک" قرار دیا، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگایا، متحدہ قومیت کا شور اٹھایا۔ انہوں نے ہر اُس شخصیت کو مطعون کیا، اُس کے خلاف دشنام طرازی اور اتہام تراشی کے ریکارڈ قائم کیے ـــــ جس کی زبان پر دینِ متین کے منفرد اور اعلیٰ ترین نظام کی بات تھی، اسلام کی اپنی تہذیب اور الگ معاشرت کا ذکر تھا۔ جس شخص نے بھی قرآن و سنّت کے احکام کی روشنی میں کفر سے معانقہ نہیں کیا، ان لوگوں نے اس کے خلاف مجادلہ کیا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی ہوں، ان کے جلیل القدر خلفاء و رفقاء ہوں، الگ اسلامی مملکت کے تصوّر کو مربوط اور باقاعدہ شکل میں پیش کرنے والے شاعرِ مشرق علامہ اقبال ہوں یا مسلمانوں کے قافلہ سالار قائدِ اعظم محمد علی جناح ہوں ـــــ "ہندو مسلم اتحاد" کے عاشق نام نہاد "علماء" کی

تیغ زبان اور سنانِ قلم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پھر جب پاکستان معرضِ وجود میں آگیا تو ان لوگوں کی کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں رُک گئیں، ان کے قلم کو لوکی لگ گئی ——— اور ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے قوم کے حافظے کو کمزور جانتے ہوئے پاکستان پر اپنی اجارہ داری ظاہر کرنا شروع کر دی۔

زبان سے پاکستان کو مجبوراً تسلیم کرنے والوں نے "تصدیق" بالقلب" کی نعمت سے محرومی کے باوصف کچھ عرصے تک علامہ اقبال اور قائدِ اعظم کو گالی دینا بند کر دیا، اُن پر بظاہر "ایمان" لے آئے اور دل کی بات کو چھپائے رکھا۔ ایسے میں بھی انہوں نے اپنی "زیرِ زمین" سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پاکستان ان کی امنگوں کا قاتل تھا، انہوں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اپنی تگ و دو جاری رکھی مگر طویل عرصے تک چھپ چھپا کر۔ اب اُن کی محنت رنگ لائی ہے، ان کی پشت پر وسائل کا انبار ہے، ان کے ہاتھوں میں اختیارات ہیں، وہ بزعمِ خود ملک و ملت پر اپنے آپ کو متصرف سمجھتے ہیں، اس لئے فضا سازگار سمجھتے ہوئے انہوں نے زبان کی تلواروں کو نیام سے نکال لیا ہے۔ اور پھر اسی "متحدہ قومیت" کی راگنی کو الاپنے لگے ہیں، پھر اقبال و قائدِ اعظم کو اتہام و دشنام کی سان پر چڑھا دیا ہے، پھر "ہندو مسلم اتحاد" کے داعیوں کے گُن گانے شروع کر دیے ہیں۔ منافقت رنگ لا رہی ہے۔

علامہ اقبال متحدہ قومیت کے سخت مخالف تھے اور "ہندو مسلم" کو ایک قوم قرار دینے والوں کے خلاف جہاد میں مصروف رہے جب حسین احمد صاحب نے ملت کو وطن سے مشتق بتایا تو علامہ اقبال کی غیرتِ ملی اور حمیتِ دینی نے شعروں کی زبان اختیار کر لی۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی، تمام بولہبی ست

علامہ اقبال کی اس گرفت کے حوالے سے حسین کے متبعین پاکستان بننے کے بعد سے خاموش رہے مگر انھوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں اور پاکستان میں رہتے ہوئے علامہ اقبال کے خلاف وہی زبان استعمال کرنے لگے ہیں، جو وہ ہندوؤں کی پشت پناہی کے عالم میں کرتے تھے۔ بعض رسالوں نے اقبال کے خلاف نمبر نکالے ہیں اور تصورِ پاکستان کے خالق کے خلاف ژاژ خائی اور ہرزہ سرائی کے نئے پہلو سامنے لائے جا رہے ہیں۔

حسین احمد نجیب رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی کہتے ہیں "علامہ اقبال عربی لغت کے لفظ "مِلّت" اور "قوم" میں کوئی فرق نہیں کرتے ...... حالانکہ قرآن و سُنّت میں ان دونوں کا مفہوم جُدا جُدا بیان کیا گیا ہے اور پھر علامہ کا "نظریۂ ملّت" بھی تو قرآن و سُنّت اور لغت عرب سے مطابقت نہیں رکھتا" (الرشید۔ مدنی و اقبال نمبر صہ ۳۱۳)۔ محمد متین ہاشمی بھی کہتے ہیں۔ "مولانا مدنی نے تو "قومیں" کہا تھا۔ لفظ مِلّت اور قوم میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عربی لغت اور محاورے کے اعتبار سے قوم کے لیے ہم عقیدہ ہونا ضروری نہیں بلکہ محض مجاورت (پڑوس) کی بنا پر بھی قوم کہا جا سکتا ہے"۔ (فیض الاسلام۔ اقبال نمبر صہ ۱۳۸) جب کہ کرنل خواجہ عبد الرشید کا نظریہ ہے کہ "اگر وہ ذرا تامّل سے مِلّت، اُمّت اور قوم کا فرق دیکھ لیتے، از روئے قرآن —— تو اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ملّت واقعی وطن سے بنتی ہے ..... ملّت کے معنیٰ NATION کے ہیں اور ملّت اوطان سے بنتی ہیں" (فیض الاسلام۔ اقبال نمبر صہ ۱۳۴) —— اس

کے ساتھ یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ حسین احمد صاحب کے نزدیک ملت اور قوم میں کوئی فرق نہیں کیونکہ بقول طالوت، انہوں نے اقبال کے اشعار پر جو وضاحت کی، اس میں فرمایا کہ انہوں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ صرف بتایا ہے کہ "آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں" —— یعنی، اگر انہوں نے ملت کے معنوں میں قوم کا لفظ نہ استعمال کیا ہوتا تو اس پر ہیچ پا ہوتے —— یوں، کرنل عبدالرشید ملت اور قوم کو ہم معنی نہیں سمجھتے لیکن اقبال کی مخالفت اور حسین احمد صاحب کی محبت میں "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" کے قائل ہیں۔ منین ہاشمی اور حسین احمد نجیب ملت اور قوم کو ہم معنی نہیں سمجھتے مگر "قومیں اوطان سے بننے" کا نظریہ رکھتے ہیں جب کہ اس فقرے کے مصنف "آج کل" کے اضافے سے وقتی طور پر اپنی جان چھڑا رہے ہیں (کیونکہ مسلمانوں کے شدید ردِ عمل سے بچنے کے لئے یہ سیاسی داؤ استعمال کرنے کے بعد بھی ان کے کئی بیانات میں پھر متحدہ قومیت کی اور قوموں کے اوطان سے بننے کی تبلیغ موجود ہے)۔

الرشید کے تازہ "مدنی و اقبال نمبر" میں حفظ الرحمٰن سیوہاروی اقبال کو غیر شائستہ اور غیر سنجیدہ قرار دیتے ہیں۔ "ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے تلخ لہجے میں کیا جو اُن جیسے شائستہ اور سنجیدہ انسان کے شایانِ شان نہ تھا۔" (صہ ۲۱۷) اور حسین احمد نجیب صاحب لو سورہ "الشعرا" کے حوالے سے اقبال کو گمراہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: "ان دو ارشادات کی روشنی میں "علامہ اقبال ایک فلسفی شاعر" کا جو مقام و مرتبہ شریعت اسلامیہ میں متعین ہو جاتا ہے، وہ ہر ذی عقل پر عیاں ہے" (صہ ۲۱۱) یہی صاحب اقبال کے خلاف اپنی زبان کو مزید دراز کرتے ہیں: "علامہ اقبال نے جن اساتذہ سے اعلیٰ دنیاوی علوم کی تحصیل کی ہے، وہ نہ صرف غیر مسلم تھے بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر تاریخ عالم

شہادت بیّنہ پیش کرتی ہے۔ پھر ان اساتذہ سے علامہ نے جو علوم حاصل کیے، ان کی اصل بنیاد تغیر پذیر مغربی فلسفہ ہے ...... انہوں نے اسی مردود مغربی تہذیب کی آغوش میں نہ صرف اپنی اولاد کو سلایا بلکہ برصغیر کے اس گروہ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں جو مغربی تہذیب میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ کی صفات کا حامل ایسا شخص اگر ان لوگوں پر علمی تنقید کرتا ہے جو علومِ قرآن و سُنّت کے نہ صرف غوّاص ہیں بلکہ ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق بسر ہوتا ہے تو ایسے شخص کو کس زُمرے میں شمار کیا جانا چاہیئے؟ اور پھر جو لوگ اس معاملہ میں اس کی پیروی کریں اور علماءِ ربّانی کے خلاف اس کی باتوں سے استدلال کریں کیا وہ شعرا یتبعھم الغاون کے ارشادِ ربّانی کا مصداق قرار نہیں پائیں گے؟" (صہ ۳۱۱، ۳۱۲)

یہی نجیب صاحب اپنے اسی مضمون میں اقبال کی "تلوّن مزاجی" کے شاکی دکھائی دیتے ہیں "علامہ اقبال مرحوم کے افکار و عمل میں یہ تلوّن مزاجی مغربی علوم کے تربیت یافتہ کسی بڑے آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھی"۔ (۳۱۳) مسئلہ قومیت پر حسین احمد مدنی صاحب کے خلاف علامہ اقبال کے اختلاف کی چوتھی وجہ یہ صاحب دین کے بارے میں اقبال کی سطحی معلومات کو قرار دیتے ہیں۔ "دینی علوم کے بارے میں سطحی معلومات بھی علامہ کے فکر و عمل کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ قرآن و سُنّت کی زبان اور اس کے علوم سے براہِ راست عدم واقفیت اس کا بڑا سبب ہے" (۳۱۴) —— یعنی قرآن و سنت کی زبان اور اس کے علوم سے واقفیت صرف انہیں ہو سکتی ہے جو گاندھی کو منبرِ رسول پر بٹھا کر اس کے چرنوں میں بیٹھ جائیں، جو اسلام اور کفر کی کھچڑی پکانے کے حامی ہوں، جو ہندوؤں کی غلامی کا جُوا گلے میں ڈالنے کے داعی ہوں، جو حق اور باطل کو باہم شیر و شکر کر دینے کا ادعا

رکھتے ہوں —— اور جو شخص اسلام کو ہندو ازم سے الگ سمجھتا ہو، دین کے ساتھ کفر کی پیوند کاری کا مخالف ہو، غیر مسلموں کی قیادت قبول نہ کرتا ہو، گاندھی کو اپنا ملجا و ماوی نہ سمجھے، وہ "گمراہ" ہے، متلوّن ہے، مغربی تہذیب کا چربہ ہے، دینی علوم سے بے بہرہ ہے ——؟؟

مملکتِ خداداد پاکستان کے بظاہر مخلص، یہ باسی نظریۂ پاکستان کے شدید مخالف بلکہ دشمن ہیں اور کبھی اس کے اظہار سے باز نہیں آئیں گے۔ آجکل علامہ اقبال کے خلاف انہوں نے اپنی زبانوں کو یوں بے لگام کر رکھا ہے کہ کسی حکیم فضل الرحمٰن سواتی کا ایک مضمون الرشید میں بھی چھپا ہے اور فیض الاسلام میں بھی۔ یہ صاحب بھی حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی طرح بھارت میں رہتے ہیں —— اور ان لوگوں کو کام کرنے کی ہدایت چونکہ اُدھر ہی سے ملتی ہے اور ہندوستان نے پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کیا، نہ وہ اسے قائم و سالم دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے ان کے اشارے پر یہ لوگ پاکستان میں کچھ اُن کے، کچھ اپنے مضمون، نظریہ پاکستان کے خلاف اور متحدہ قومیت کے حق میں چھاپ کر اقبال و قائدِ اعظم کو مطعون کرتے ہیں۔

سوادِ اعظم اہلِ سُنّت و جماعت کے خلاف بھی ان کی زبانیں اسی لئے کھلی ہیں اور ان کا ہر اخبار، جریدہ اور شخص صبح و مسا سُنیوں کو گالی دینے میں لگا ہوا ہے کہ سوادِ اعظم نے "آل انڈیا سُنی کانفرنس" کے جھنڈے تلے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا اور قیامِ پاکستان کی جنگ لڑی تھی [۱] —— سو حکیم فضل الرحمٰن سواتی مقیم

---

[۱] اہلِ سُنّت کی خدمات جلیلہ سے کما حقہٗ واقفیت کے لیے حسبِ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے (۱) تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم از پروفیسر محمد مسعود (۲) خطبات آل انڈیا سُنی کانفرنس از محمد جلال الدین قادری (۳) سات ستارے از حکیم محمد حسین بدر (۴) اکابر تحریک پاکستان اوّل، دوم تالیف محمد صادق قصوری۔ (زبیر احمد قادری ضیائی)

آمبور جنوبی ہند لکھتے ہیں۔ "ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم بڑے جوشیلے اور جذباتی آدمی تھے جب کبھی اپنے نظریے کے خلاف کسی میں کوئی بات دیکھ لیتے تو فوراً جوش میں آکر اس پر تنقید فرماتے"۔ (الرشید ۳۲۱۔ فیض الاسلام ۱۷۷)

یوسف سلیم چشتی اس سلسلے میں اقبال کو گالی دینے کا نیا انداز اپناتے ہیں۔ "میرا دل نہیں مانتا کہ علامہ اقبال مرحوم اخلاقی اعتبار سے اتنے پست افرومایہ تھے کہ ایک مشہور و معروف عالمِ دین ...... کے لئے ایسا ناروا لفظ استعمال کرتے .... دشنام طرازی شریفوں کا شیوہ نہیں" (الرشید ۳۶۲، ۳۶۳) —— یہ یوسف سلیم چشتی شارح اقبال کی حیثیت سے بھی بہت مال کما چکے ہیں، کبھی کبھی اقبال کی خدمت میں "حاضری" کو بھی زندگی بھر فروخت کرتے رہے مگر اب یہ فیصلہ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں کہ اقبال جیسے "غیر شریف" انسان کے پاس جانا ان کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی۔ "علامہ اقبال کی خدمت میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے بھی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء قریباً ۱۳ سال تک حاضر ہونے کا موقع ملا" (الرشید ۳۶۲)

—— ان حضرات نے اس "جرم" کی "یادداشت" میں کہ حسین احمد دیوبندی کو اقبال نے مصطفٰے کے قدموں تک پہنچنے کا مشورہ کیوں دیا، اس کی جوانی کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا شروع کر دی۔ اور کرنل عبدالرشید نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اسی وجہ سے انہوں نے لیڈی اقبال سے علیحدگی اختیار کی تھی اور "حقہ چھوڑنے سے پہلے کئی دوسری چیزیں چھوڑ دی ہوئی تھیں"۔ (فیض الاسلام ۱۳۵، ۱۳۶)۔

مولوی حامد میاں نے حسین احمد صاحب کی حمایت اور اقبال کی مخالفت میں کھل کر "متحدہ قومیت" کے تصور کو درست قرار دیا ہے، کہتے ہیں "ان (حسین احمد صاحب) کا علم دین، سیاسی اور تاریخی بصیرت ہندوستان میں اس اشتراک عمل کو درست قرار دے رہی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بصیرت اور معلومات میں یورپ کی سیاست، تاریخ اور اس کے جدید نظریات بھی تھے۔" (الرشید ۴۱۲) ——

سُنیوں نے من حیث الجماعت تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اس لئے ان رسالوں میں بھی ان کے خلاف سینکڑوں صفحات لکھے گئے ہیں اور مسلم لیگ چونکہ مسلمانوں کے لئے علٰحدہ ملک کے حصول کی جد وجہد میں اہل اسلام کی وحدت کا نشان تھی، اس لئے اس کے خلاف بھی سب کچھ کہا گیا ہے۔ حسین احمد نجیب لکھتے ہیں "مسلم لیگ جو ہندوستانی عوام کی نظر میں انگریز کی پروردہ جاگیرداروں اور خطاب یافتہ سَروں اور نوابوں پر مشتمل انگریزوں کی حلیف پارٹی شمار ہوتی تھی، اُمتِ مسلمہ کی قیادت علماءِ حق (؟) سے چھین کر مغرب زدگی کے شکار لیڈروں کے ہاتھوں میں تھما دینے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی"۔ (الرشید ۳۰۱) — جی ہاں۔ یہ سب کچھ پاکستان میں شائع ہو رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، کسی کو غیرت محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوؤں کے ان خانہ زاد غلاموں کو اس سے باز رکھا جائے۔ نظریہ پاکستان کی حفاظت کے دعووں پر مشتمل بڑی خوبصورت تحریریں، بڑے اچھے بیانات ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں لیکن تحفظِ نظریہ پاکستان کے دعویداروں کو یہ کھلی تحریریں دکھائی نہیں دیتیں یا دکھائی نہیں جاتیں — اسی مضمون میں لکھا ہے کہ پاکستان انگریزی ڈپلومیسی کا شاہکار ہے — "جب تحریکِ آزادی ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تو انگریزی ڈپلومیسی نے قدیم فلسفہ پھر دہرایا اور برِصغیر کی مختلف نظریاتی جماعتوں کو باہم ٹکرا دینے کا منصوبہ بنایا"۔ (۳۰۰)۔ حضرات! اس حقیقت کو مت بھولئے کہ پاکستان ہی کا ایک رسالہ ہے، افکار اگرچہ بھارتی ہیں۔

بات چونکہ حسین احمد صاحب کے اس دیاکھیان کے گرد گھوم رہی ہے کہ انہوں نے اوطان سے قوموں کی "ساخت" کے بارے میں کیسے بات کی تھی۔ اس لئے ایک اور حوالہ بھی دیکھ لیجئے، جس سے یہ واضح ہو گا کہ اس بیان کی تاویلیں محض

دھوکا دینے کے لئے کی جاتی ہیں ورنہ اس طبقے کے خیالات میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ پاکستان کے قیام کو غلط سمجھتے ہیں، بے بنیاد قرار دیتے ہیں، بے نتیجہ گردانتے ہیں۔ اور ان کا آج بھی عقیدہ یہی ہے کہ اسلام دِ سلام سب بے فائدہ ہے، قومیں تو اوطان ہی سے بنتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، عزیز الحسن صدیقی غازی پوری کا مضمون "ایک مردِ مومن وحق پرست کی مثالی زندگی" کا ایک اقتباس ——

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے جب یہ فرمایا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" (اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن پہ بہتان نہیں تھا، انہوں نے واقعی فرمایا تھا۔ محمود) تو اقبال مرحوم نے شدید تنقید ہی نہیں، ان کی تذلیل بھی کی تھی اور اس خیال کی تردید میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ کاش مرحوم آج حیات ہوتے اور اس نظریہ کی بنیاد پر (اپنے) پاکستان کے دستور کی تدوین کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں یقین آجاتا کہ شیخ وقت اور امام ہند کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نقش بر آب یا باد بہوا نہیں تھے۔ بلکہ ایک ایسی حقیقت تھے جس کو دنیا نے تسلیم کرلیا۔ (الجمعیۃ دہلی۔ ابوالکلام آزاد نمبر۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۴ء۔ ص ۱۳۲)۔

یہ لوگ مختلف طریقوں سے پاکستان کا ایک حصہ الگ کرا چکے ہیں، اب چاہتے ہیں ملک میں خانہ جنگی ہو جائے، کوئی ایک آدھ صوبہ الگ ہو جائے یا پاکستان کی سالمیت کو اور کوئی نقصان پہنچ جائے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ دیکھا، ہمارے "شیخ الاسلام" صاحب نے جو پاکستان کی مخالفت کی تھی، وہ ٹھیک تھی۔ ہم اگر ہندو کے غلام ہوتے تو بہتر ہوتا ——

یہ لوگ جو محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثنا کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ نعوذ باللہ، وہ مر کر مٹی میں مل گئے ہیں، وہ کسی کا بھلا بُرا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ــــ اپنے انہی رسالوں میں حسین احمد صاحب کے بارے میں اس

عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ یوسف سلیم چشتی صاحب کہتے ہیں۔ ؎

گردن نہ جھکی جس کی کسی شاہ کے آگے

جس کے نفسِ گرم سے مُردوں میں پڑی جان۔ (الرشید ۳۶۳)

علامہ اقبال نے "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی گردان کرنے والے ان حضرات کو گاندھی کے چرنوں کے بجائے محمد عربی کے قدموں میں آنے کی دعوت دی اور انہیں کہ اسلام کو کفر کا تابع مہمل بنانے کی کوشش کرنے والو، تم مقامِ رسولِ پاک سے بے خبر ہو ——— اس پر شریف احمد طاہر کا استدلال ملاحظہ ہو۔ "کیا مقامِ محمد عربی سے بے خبر حافظ القرآن والاحادیث ہو سکتا ہے؟ اور اگر صحیحین کا محدث بھی مقامِ محمد سے بے خبر رہتا ہے تو باخبر کون ہوتا ہے؟ اگر قال اللہ وقال الرسول کا درس دہندہ مقامِ محمد عربی سے ناواقف ہے تو ———" (الرشید ۳۸۰) یعنی آپ قرآن وحدیث کا کچھ علم حاصل کر کے اگر خدا اور رسول کے منکر ہو جائیں یا ان کے احکام کی صریح خلاف ورزی کریں اور اس پر افتخار کا اظہار کریں تو آپ سیدھے راستے پر ہیں؟؟۔

اقبال کے خلاف ان رسالوں میں جو اشعار شائع کیے گئے ہیں، ان میں بھی ان لوگوں کی دریدہ دہنی انتہا کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بھئی، جو شخص اپنے آپ کو مصطفےٰ تک نہیں پہنچاتا، اس کے ابولہب ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ مگر اقبال کو گالی دینے کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔ یہ دیکھئے کہ اسے کس کس جرم "پر ابولہب" کہا جا رہا ہے۔ درج ذیل پہلا شعر اشرف علی تھانوی صاحب کے ایک مرید، دارالعلوم دیوبند کے شیخ التفسیر، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث ریاست ہائے متحدہ بلوچستان کے وزیر معارف شرعیہ اور جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے شیخ التفسیر ——— شمس الحق افغانی صاحب کا ہے:

نظامِ قوم بدو گونہ می شود پیدا ‏ ‏ ‏ اگر منوز ندانی، کمال بولہبی ست

(الرشید ۲۴۷)

اظہار الحق سہیل عباسی امروہوی "شانِ ابولہب" بیان کرتے ہیں :

بہر شنیدہ مدہ گوش پرس پرسان نیز
بہر شنیدہ نزدن چانہ، شانِ بولہبی ست (۳۷۸)

اقبال سہیل کی جو طویل نظم شامل اشاعت ہے، اس کا زور ملاحظہ ہو۔

نظر نہ بودن و بادیدہ ور درافتادن
دو گوشہ شیوۂ بوجہلی و بولہبی ست (۳۳۶)

علامہ اقبال کا پیغام تھا کہ "بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"
مگر اس کے مقابلے میں اقبال سہیل کہتے ہیں "بگیر راہ حسین احمد از خدا خواہی"۔
الرشید کے "مدنی و اقبال و نمبر" میں شریف احمد طاہر نے علامہ اقبال کے تینوں شعروں کا تجزیہ کرنے کی جو سطحی اور عامیانہ کوشش کی ہے، وہ قارئین کے تفنن طبع کے لئے تین صفحوں پر شائع کی گئی ہے مگر ان صاحب کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ اسے "رباعی" قرار دیتے ہیں۔ "اقبال مرحوم کی وفات کے بعد "ارمغان حجاز" میں یہ رباعی کیوں چسپاں کر دی گئی"۔ اور "یہ رباعی فارسی میں ہے یا کہ اردو میں"۔ (۳۸۱) آغا شورش کاشمیری نے ان تین شعروں کو چار شعر قرار دیا تھا "آپ نے چار شعر کہے جو ہر کہ و مہ کی نوک زبان ہو گئے"۔ (چٹان ۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء صد ۱۳)
"الارشاد" اٹک کے ایڈیٹر صاحب بھی اسے رباعی ہی سمجھتے ہیں۔ (بحوالہ الرشید محرم ۱۳۹۹ھ) لیکن ان لوگوں کے ان رسالوں میں اقبال کے خلاف زبان کھولنے کے جو مظاہر ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ علامہ اقبال ہی کے کچھ شعر "اقبال بنام اقبال" کے عنوان سے شائع کیے گئے ہیں[1] مثلاً

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

---

[1] اس فکر کی روشنی میں "ننگِ اسلاف" کو بھی ننگ اسلاف ہی سمجھنا چاہیئے۔

(زبیر احمد قادری ضیائی)

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

الرشید کے "مدنی و اقبال نمبر" کے آخر میں "لیڈر اعظم" کے عنوان سے "حضرت شاکر سیالکوٹی" کی ایک نظم اقبال کے خلاف ہے۔ جی ہاں سب اہل پاکستان کی غیرت کو چیلنج کے انداز میں ——

مذہبیت سے ہے لیڈر بے خبر — عشق ہے پتلون سے اور کوٹ سے
خبثِ تہذیبِ نوی سے آشکار — حملے گو کرتے ہیں ٹوڈی اوٹ سے
ظالمو! یہ عالموں پر پھبتیاں — بچنا دستِ بے صدا کی چوٹ سے

قارئین کرام! میں نے اسی موضوع پر سید نور محمد قادری صاحب کی علمی تحقیقی کاوش [1] سے پہلے آپ کے درِ احساس پر دستک دینے کی جسارت یوں کی ہے کہ حسین احمد صاحب تو اسلام اور کفر کی جنگ میں اپنا کردار ادا کر چکے۔ اب ان کے متبعین ان کا دامن تھامے، منافقت کی نقاب اٹھائے، نظریہ پاکستان پر چاروں طرف سے حملہ آور ہیں۔ وسائل کی بہتات ان کا مرکب ہے اور زبان و قلم کے ہتھیاروں کو وہ پاکستان، بانی پاکستان، خالقِ تصورِ پاکستان اور غازیانِ تحریکِ پاکستان کے خلاف آزادانہ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ عشقِ رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی سپرِ خیال کیجیے، وطن کی محبت کے تیر و سناں سے مخالفین کی صفیں الٹ دیجیے، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

محمود میانوی

---

[1] سید نور محمد قادری صاحب الرشید کے مدنی و اقبال نمبر کی طباعت سے کئی ماہ قبل اپنا مقالہ مکمل کر چکے تھے۔ (زبیر)

پس منظر

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ

ز دیو بند حسین احمدؔ ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست

اگر بہ اُو نرسیدی، تمام بُولہبی ست

مولانا حسین احمد دیوبندی کا یہ ارشاد کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء کی اسی سالہ (۱۸۵۷ تا ۱۹۳۷) جدوجہد کا شہکار MASTER PIECE تھا۔ کانگرس کو امید تھی کہ مولانا کی اس شاہ ضرب سے مسلمانوں کے ملی تشخص اور اس تشخص کے تحفظ کی تمام کوششیں نیست و نابود ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن کانگرس کی امیدوں کے برعکس ایک

مردِ حق آگاہ نے مولانا کو للکارا اور کہا کہ مولانا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ "مقامِ محمدی" سے بے خبری کا نتیجہ ہے اور آپ کا ارشاد "بولہبی ست" سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس مردِ مومن کی اس بر وقت پکار کا یہ اثر ہوا کہ باطل کا سارا کیا کرایا تلپٹ ہو کر رہ گیا ؎

مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعدا تیرے

نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

(رضا بریلوی)

جی چاہتا ہے کہ اس کتابچہ میں اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے لیکن اس کے لیے حضرت علامہ کی اس عظیم مساعی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے جو انہوں نے "دو قومی نظریہ" کے سلسلہ میں اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء سے لے کر مولانا کے بیان تک کی ہے۔ تاکہ حقیقت پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آجائے۔

شروع میں حضرت علامہ اقبال بھی متحدہ قومیت یعنی نسلی اور جغرافی بنیادوں پر ایک

قوم ہونے کے حامی تھے ۔ اس دور کی نظموں میں انہوں کے اس نظریہ کو بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے ۔ خاص طور پر ان کی مندرجہ ذیل نظمیں اس نظریہ کی بہترین ترجمان ہیں ۔

۱ - ہمالہ

۲ - ترانۂ ہندی

۳ - نیا شوالہ

۴ - پرندہ کی فریاد

۵ - صدائے درد

۶ - تصویرِ درد وغیرہ

بلکہ نیا شوالہ[۱] کی نظم کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں حضرت علامہ کے

---

۱ نیا شوالہ کی نظم اقبال کے مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں لیکن اُن کے غیر مطبوعہ کلام کے مجموعہ "رختِ سفر" مرتبہ انور حارث میں شامل ہے ۔ اس نظم کے چند اشعار "اقبال کے سیاسی کارنامہ" کے حوالے سے ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں ۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے | تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا | جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے | خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی | آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ | دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو | اس ہر دوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں
ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اُس صنم کے | بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے | سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

(اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں ۔ اقبال اکیڈمی لاہور ص ۱۷-۱۸)

دل و دماغ پر اکبر کے تخلیق کردہ دینِ الٰہی اور بھگتی تحریک کے گہرے اثرات تھے" اقبال کا سیاسی کارنامہ"، کا مصنف اس نظم کے بارے میں رقم طراز ہے " اس نئے شوالے کا صنم کون ہے جس کو پوجنے کی شاعر تلقین کر رہا ہے۔ شاعر نے پہلے ہی بند کے آخری شعر میں یہ برملا کہہ دیا ہے کہ " خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے"۔ اقبال اس زمانہ میں ایک " نیا شوالہ"، بنا رہا ہے اور اس میں اپنے حسین تخیل کی تراشی ہوئی موہنی مورتی " ہندوستان" کو نصب کر کے اس کی سندرتا میں خود کھو جانا اور دیس کے سارے رہنے بسنے والوں کو پیت کی مے پلا کر اس مورتی کے قدموں پہ لا ڈالنا چاہتا ہے۔ ابھی تو وہ آذری کر رہا ہے۔ براہیمی دور ابھی دور ہے۔ وہ گلے میں زنار پہنے تسبیح ہاتھ میں لینا اور ناقوس کو آوازۂ اذان میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے یہ خیالات کبیر کی تحریک اور اکبر کے دینِ الٰہی سے کس قدر زیادہ قریب ہیں۔ اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہندوؤں کے دھرم اور مسلمانوں کے مذہب کو ختم کر کے نیا دین جاری کیا جائے۔ کبیر بھی مذہبی اختلاف کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی تحریکِ اتحاد کا مرکز " جوگ"، ہے۔ اقبال بھی اکبر و کبیر کی مانند دھرموں کے بکھیڑوں کو پیت کی اگنی میں جلا کر بھسم کر ڈالنا چاہتا ہے اور متحدہ قومیت کی تعمیر وطن کی محسوس بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے باہمی پریم، محبت، اتفاق و اتحاد کا فارمولا اس کے پاس یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی صنم کے پجاری بن جائیں اور یہ صنم سوائے ہندوستان کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ گویا مذہب وجہِ اختلاف ہے اور وطن مرکزِ اتحاد" (تلخیص) ع[۲]

(اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء ص ۱۸ تا ۲۰)

ع۲ محمد احمد خاں۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۱۸ تا ۲۰

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت علامہ نظریۂ وطنیت کے نہ صرف حامی تھے بلکہ زبردست مبلغ بھی تھے۔ لیکن جب اُردو۔ ہندی اور ذبیحۂ گاؤ کے آئے دن کے جھگڑوں میں ہندو ذہنیت پوری طرح بے نقاب ہو گئی اور پھر تقسیم بنگال کے موقع پر جو محض انتظامی سہولتوں کی وجہ سے عمل میں لائی گئی تھی کانگرس کا مسلم مفاد کے خلاف رویّہ کھل کر سامنے آ گیا تو حضرت علامہ کے نظریات میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔

اسی زمانہ میں حضرت علامہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ تشریف لے گئے، اور اپنی آنکھوں سے انہوں نے فرنگی نظریۂ وطنیت کے بھیانک، اور مذموم عزائم و اثرات کا مطالعہ کیا تو وہ کلیتہً اس سے متنفر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ مسلمانوں کے ملّی تشخص (ملّی انفرادیت) اور جداگانہ نیابت کے اصولوں کو بنیاد بنا کر قائم ہوئی تو حضرت علامہ دورانِ تعلیم ہی لندن میں مسلم لیگ کی شاخ کی مجلسِ عاملہ کے رکن بن گئے۔ سرگذشتِ اقبال کے مرتب کا بیان ہے۔

"اقبال کے قیامِ یورپ کے دوران ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی۔ مئی ۱۹۰۸ء میں کیکسٹن ہال میں سیّد امیر علی کی صدارت میں لندن میں مقیم مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سیّد امیر علی صدر چنے گئے اور علامہ اقبال کو مجلسِ عاملہ کا رُکن منتخب کیا گیا۔ بلکہ قواعد و ضوابط کی ترتیب کے لیے جو کمیٹی مقرر ہوئی۔ اُس میں بھی سیّد امیر علی اور سیّد حسن بلگرامی کے ساتھ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔" ع[۳]

حضرت علامہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس اصول "متحدہ وطنی قومیت

ع۳۔ ذکرِ اقبال ص ۵۷، بحوالہ سرگذشتِ اقبال مرتبہ عبدالسلام خورشید۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۶۰

اور مسلم اقلیت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں"، کو لے کر سیاست میں داخل ہوئے اور اپنی پوری تیس سالہ سیاسی زندگی میں اس اصول پر سختی سے کاربند رہے اور ایک دن کے لیے بھی اپنے قائم کردہ مؤقف سے سرمو پیچھے نہ ہٹے۔ حالانکہ دوسرے بڑے بڑے مسلمان لیڈروں مثلاً قائدِ اعظم۔ سر آغا خاں۔ راجہ محمود آباد۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا حسرت موہانی۔ سر عبدالقادر۔ ابوالکلام آزاد اور مولانا بدایونی کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ علامہ اقبال اپنی پوری سیاسی زندگی میں اپنے مذکورہ مقرر کئے ہوئے اصول پر جس پختگی اور ایمان سے قائم رہے ہندوستان بھر میں وہ غالباً واحد مثال ہے۔ تحریک عدم تعاون۔ سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کے زمانہ میں انہوں نے اپنے دوستوں سے مخالفت مول لے لی۔ لیکن مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور جداگانہ انتخاب کے مطالبہ و اصول کو دھکا نہ لگنے دیا۔

موجودہ نسل تاریخ سے تقریباً ناواقف ہے اس لیے آگے جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ سیاسی زبان میں نظریۂ وطنیت کیا ہے تاکہ آئندہ اوراق کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ محمد احمد خاں صاحب نظریۂ وطنیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے جس فضا میں نشوونما پاتا اور جس زمین پر وہ رہتا بستا ہے اس سے اس کو ایک گونہ محبت ہو جاتی ہے اور یہ ایک فطری لازمہ ہے اور اس کی محبت فطری تصور۔ لیکن سیاسی زبان میں وطن سے مراد یہ نہیں ہے بلکہ وطن سے مراد وطنیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکزِ اتحاد ہے ان تمام لوگوں کے لیے جو اس میں بستے ہیں وطن کا یہ تصور ان تمام انسانوں کو جو ایک مخصوص جغرافی خطہ میں بستے ہیں ایک منظم جماعت قرار دیتا ہے جن کا باہمی مفاد ایک ہے جن کی زندگی کا نصب العین ایک ہے اور جن کا لائحہ عمل ایک ہے اس طرح روئے زمین کے تمام انسان مختلف مخصوص جغرافی خطوں میں تقسیم ہو کر مختلف قومیتیں بناتے ہیں۔ ان میں سے ہر قومیت کے افراد کے باہمی مفادات میں ممکن ہے ہم آہنگی ہو لیکن مختلف قومیتوں

میں ہم آہنگی کی بجائے تضاد پایا جاتا ہے۔ پھر یہ تضاد ان کو باہمی مسابقت مقابلہ اور بالآخر مقاتلہ تک لے جاتا ہے۔ سیاسی زبان میں جب وطن کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے مضمرات یہی ہوتے ہیں اور یہی وطنیت اسلام سے ٹکراتی ہے لیکن وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ اقبال نے خود اس نکتہ کی تشریح کی ہے وہ فرماتے ہیں "اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنے حُب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اُس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پسِ منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔" (مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۷۶) ع

اسلام کے تصورِ قومیت اور سیاسی نظریۂ وطنیت کے بارے میں ایک اور مسلم مفکر جناب ابوالخیر کشفی صاحب کے ارشادات سنیئے فرماتے ہیں وہ پاکستان کا تصورِ قومیت اسلام سے عبارت تھا اور علمائے دیوبند نے قومیت کا پیوند وطن کے ساتھ لگایا۔ ان حضرات نے اس پر غور نہیں کیا کہ وطن ایک سیاسی نظریہ بن چکا تھا اور محض حبّ وطن تک محدود نہ تھا۔ پھر وطنیت اپنی تنگی کی بناپر اسلام کی ضد تھی۔ اس مسئلہ پر اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کی باہمی بحث سے تو ہم سب واقف ہی ہیں اور پھر اقبال کے وہ مشہور شعر ع

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است الخ

حقیقت وہ تھی جو اقبال بیان کر رہے تھے اور جسے مسلم قوم نے قائدِ اعظم کی قیادت

ع؎ اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۸/۴۹

میں اپنی منزل قرار دے لیا تھا اور علمائے عصر کی ایک جماعت اصطلاحی مباحث میں مبتلا تھی۔ اقبال نے ۱۹۰۸ء کے بعد ہی اپنی نظم "وطنیت" میں اس مسئلہ کو جس طرح پیش کر دیا تھا وہ ۱۹۴۷ء میں اور آج بھی حرفِ تازہ کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ اس دلیل کی بنیاد اسلام کی وہ آفاقیت ہے جو وقت پر خندہ زن ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے[۵]

"وطنیت" اس موضوع پر حضرت علامہ کی حرف پہلی ہی نہیں بلکہ ایک جامع ترین نظم ہے۔ اور اس کے بعد اس موضوع پر حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے وہ اسی نظم کی تفسیر و تشریح ہے۔ اس نظم کی افادیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے مکمل شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وھو ھذا

"وطنیت" (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے)

اس دَور میں مے اور ہے جام اور جم اور   ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور   تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے   غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے؟

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی   رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

---

۵ نقوش ۱۲۳ "اقبال نمبر" اقبال کے ساتھ ساتھ از ابوالخیر کشفی ص ۸۲

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے (بانگِ درا)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ "وطنیت" یا اس قبیل کی اور نظمیں لکھنے کے بعد حضرت علامہ کا دل حبِ وطن کے جذبہ سے خالی ہو گیا تھا۔ حُبِ وطن کا جذبہ آخری ایام تک اُن کے دل کو گرماتا رہا اور ان کی آخری دور کی نظموں میں اس موضوع پر کئی بہترین شہ پارے ملتے ہیں۔ ہاں اسلامی علوم کے وسیع مطالعہ اور اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر وہ جدید سیاسی وطنیّت کے شدید مخالف ہو گئے تھے اور تمام عمر اس کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

یورپ سے واپسی اور پنجاب مسلم لیگ میں شمولیّت:

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علامہ مسلم لیگ کی لندن شاخ کے ممبر بن گئے تھے اس لیے جب یورپ سے واپس پلٹے تو پنجاب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ آپ کے ایک مخلص دوست جناب مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں "وہ تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ وطن واپس آئے تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اس لیگ کے صدر مولوی شاہدین مرحوم تھے۔ سر محمد شفیع سیکرٹری تھے اور میں اسسٹنٹ سیکرٹری۔ اقبال آئے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیّت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے"۔ ع[۶] یہ وہ دور ہے

ع[۶] "ملفوظاتِ اقبال" مرتبہ محمود نظامی طبع دوم لاہور ص ۱۰۲-۱۰۳

جب سیاسی وطنیت اور مسلم قومیت کے نظریے موضوعِ بحث ہوئے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور جداگانہ نیابت کا پروگرام لے کر نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے ان نظریوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں سنہ ۱۹۱۰ء میں حضرت علامہ نے ایک انگریزی مقالہ لکھا جو علی گڑھ کالج میں پڑھا گیا۔ بعدہٗ اس مقالہ کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے بنام "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کیا اور اس ترجمہ کو سنہ ۱۹۱۱ء میں برکت علی ہال لاہور میں پڑھا۔

مسلم قومیت کے نظریہ اور سیاسی وطنیت کے نظریہ پر حضرت علامہ کی یہ پہلی نثری تحریر ہے جو بہت مفصل اور جامع ہے۔ یہ تحریر اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے لیکن اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں۔ ہاں چند ضروری مفصل اقتباسات ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علامہ کی یہ تحریر "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر"، کوئی نایاب نہیں لیکن پھر بھی بہت کم مضمونوں اور مقالوں میں اس کے حوالے نظر آتے ہیں خدا جانے ایسا کیوں ہے حالانکہ حضرت علامہ کے سیاسی نظریات کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ازحد ضروری اور ناگزیر ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی ہیئتِ ترکیبی اور ملی عصبیت کے بارے میں علامہ رقم طراز ہیں "مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ہے۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ جس کی تجسمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس

میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائلِ مخصوصہ و شمائلِ مختصہ پر نہیں ہے غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومِ عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا۔ اس کی پولٹیکل نشو و نما میں بہت بڑا حصّہ لیا لیکن اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کو رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفسِ ناطقہِ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے۔ زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قومِ عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برقِ چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا۔ لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولان گاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیوں کر ممکن تھا کہ وہ قومیّت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصوّر کرے۔ قومیّت کا ملکی تصوّر جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قومیّت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کر کے اور ان میں رقابت کے اس ہیجِ القوام عنصر کو پھیلا کر فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اُس نے فنونِ لطیفہ و علومِ ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیّت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے مادی شے کا تالیہ ہے جو سراسر اصولِ اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرکِ خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں جذبۂ حُبِّ وطن کا سرے

سے مخالف ہوں۔ ان قوموں کے لیے جن کا اتحاد حدودِ اراضی پر مبنی ہو اس جذبے سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِّ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے۔ ہم مسلمانوں کی عصبیت عے پر نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیّت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی ان کی وطن پرستی،، عے

مسلمانوں کی مذہبی عصبیّت اور دیگر قوموں کی عصبیّت میں فرق :

اس سلسلہ میں حضرت علامہ کا ارشاد ہے :

"اقوامِ عالم پر نظر ڈالیے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیّت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیے۔ وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا جو اس کی قومیّت کی روحِ رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدن اس کے ملک یا پولٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کر دیکھیے، پھر اس کی جبلّی عصبیّت کا شعلہ بھڑک نہ اُٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیّت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اُس خطۂ زمین پر جسے اُس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیّت کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے، معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیّت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیّت ایک شے معہود فی الذہن ہے موجود فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہرِ آفرینش کے متعلق

عے خطباتِ اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو مطبوعہ دہلی اپریل ۱۹۴۶ء ص ۸۹ تا ۹۱

ایک خاص قسم کا اشتراکی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو بُرا کہنا ہماری آتشِ عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے تو میری دانست میں یہ برافروختگی اُس فرانسیسی کے غصّے سے کچھ کم واجبی نہیں جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اُٹھتا ہے۔" ع۸

اسلامی قومیّت کے بارے میں حضرت علامہ مزید فرماتے ہیں "اسلام میں قومیّت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصوّر اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصوّر ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔" ع۹

اسلامی تعلیم اور جدید تعلیم کے بارے میں حضرت علامہ اپنے خیالات و تاثرات کو یوں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں:

"ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو میری رائے میں قوم کے لیے بمقابلہ اُس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجویٹ کے زیادہ سرمایۂ نازش ہے جس کی نظروں میں اسلام اصولِ زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلۂ جلبِ منفعت ہے جس کے ذریعے سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا

ع۸ ایضاً ص ۹۱/۹۲

ع۹ ایضاً ص ۹۲

مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصّر کو لا محالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی وادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیّت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دار العلم کی ضرورت میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ بشرطیکہ یہ دار العلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایّامِ گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمانوں کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیّت کی جان ہیں۔ مسلمان کو بیشک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکّے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی امتیازی یا اتحادی مرکز نہ ہونے کے اپنی شخصیّت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گردوپیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی۔ لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیّت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں

جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروغ کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ۔ اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیئے۔ ندوہ۔ علی گڑھ کالج۔ مدرسۂ دیوبند اور اسی قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع اغراض کا مرکزی دار العلوم ہونا چاہیئے جہاں افرادِ قوم نہ صرف قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمان کو ڈھلنا چاہیئے۔

پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دار العلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے اعلیٰ تخیل۔ زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے صحیح مفہوم کی تعبیر لازمی ہے۔"[۲]

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ یہ لیکچر اس وقت علی گڑھ کالج میں پڑھا جا رہا تھا۔ جب تمام ہندوستان کے دردمند اور مخلص مسلمان اسے یونیورسٹی کی شکل دینے کی کوشش کر رہے تھے اور علامہ اقبال بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ آخر ان دردمند مسلمانوں کی مساعی کامیاب ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں عین اس وقت جب خلافتیے مسلمانوں کی اس سب سے بڑی درسگاہ کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس نے یونیورسٹی

۲۔ ایضاً ص ۱۰۳ تا ۱۰۵

کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس لیکچر میں حضرت علامہ نے علی گڑھ کالج کے کارکنان اور اس ساتھ ہی دیگر علوم اسلامی کی درسگاہوں مثلاً دیوبند وغیرہ کو چند تعلیمی مشورے بھی پیش کئے جن پر عمل پیرا ہو کر یہ درسگاہیں مثالی درسگاہیں بن سکتی تھیں اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد دین و دنیا کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتے تھے۔ علی گڑھ والوں نے تو حضرت علامہ کی نصیحت کو پلے باندھ لیا اور حتی الامکان اس پر عمل بھی کیا یہی وجہ ہے کہ علوم اسلامی کے جتنے بلند پایہ سکالرز علی گڑھ نے پیدا کئے ہیں دیوبند یا ندوہ نے نہیں محض تین نام ملاحظہ ہوں۔

(۱) ڈاکٹر سید ظفر الحسن (۲) سید سلیمان الشرف (۳) ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری مصنف

"THE QURANIC FOUNDATIONS AND STRUCTURE OF MUSLIM SOCIETY"

اس عظیم اسلامی تصنیف کے متعلق عظیم قانون دان اے۔ کے بروہی صاحب فرماتے ہیں۔

"یہ میری بے لاگ رائے ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خطبات کے بعد، یہ، قرآنی ادب میں انتہائی قابل قدر اضافہ ہے۔ اس موضوع پر دوسری کتاب جو میرے ذہن میں آتی ہے، صرف مولانا ہی کی کتاب ہے۔ جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ بنیادی اثرات کے حامل عقائد و نظریات اور اُن کے بارے میں اسلام کے موقف کو جدید فکری اصطلاحات میں نئے سرے سے بیان کیا جائے۔ جسے پڑھ کر قاری کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام کی ماورائی حیثیت برقرار ہے اور یہ جدید افکار و عقائد اور اعمال کے نشو و ارتقا پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

اور ساتھ ہی اس قابل ہے کہ ان نتائج فکر کو مرتبط کر سکے، جو اس کی تعلیمات اور قواعد سے ہم آہنگ ہیں" (ترجمہ) ع۱۱

لیکن اس کے برعکس دیوبند وغیرہ نے حضرت علامہ کو محض "تہذیب حاضر کا فرزند" سمجھا اور ان کے مشوروں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکتبۂ فکر کی اکثریت صحیح اسلامی شعور سے بے بہرہ رہی اور برّصغیر کی سب سے عظیم اسلامی تحریک کے زمانہ میں گاندھی جی کی دم چھلا بن کر رہ گئی۔ لیکن دوسری طرف تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے مثلاً مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شوکت علی۔ سردار عبدالرب نشتر۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ سید امیر الدین قدوائی۔ ڈاکٹر افضال قادری اور پروفیسر ایم۔ ایم۔ احمد وغیرہم۔

مناظر لکچر حضرت علامہ کی پہلی نثری تحریر ہے جس میں "وطنیت"، "مسلم قومیت اور ملی تحفظ (جس کا دوسرا نام قومی عصبیّت ہے) کے نظریوں پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ اس لیکچر میں انہوں نے جو بنیادی نظریے قائم کئے ہیں وہ عمر بھر ان پر عمل پیرا رہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ جوں جوں ان کا مطالعۂ اسلام بڑھتا گیا تجربہ و مشاہدہ تیز ہوتا گیا تو ان نظریوں میں مزید نکھار۔ حسن اور استحکام پیدا ہوتا گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس دور میں "مسلم قومیت" اور "ہندی قومیت" (وطنیت) کے اثبات میں دونوں اطراف کے دانش ور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ تو وہ لوگ تھے جو امتِ محمدیہ کے بقا و تحفظ کے لیے "مسلم قومیت" کے نظریہ کو اپنانا ضروری سمجھتے تھے ایسے لوگوں میں سرِ فہرست حضرت علامہ اقبال کا اسمِ گرامی تھا اور کچھ وہ تھے جو نظریۂ ہندی قومیت کو دل و جان سے قبول کر چکے تھے اور اس کی تشہیر و

ع۱۱ THE "MINARET" KARACHI JULY 1974 PAGES 49-50

تبلیغ کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے ان میں گاندھی۔ نہرو۔ بدر الدین طیب اور کچھ علمائے کرام نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

اسی زمانہ میں ایک نئی علمی شخصیت ابھری۔ اس شخصیت اور علامہ اقبال میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں صوفی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کا سرمایۂ دین و دنیا عشقِ رسول تھا۔ اس شخصیت نے مسلم قومیت کے تصوّر کے احیاء کے لیے بڑے وزن دار مقالے لکھے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(۱) "ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب (قرآنِ مجید) کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نما بنائے وہ مسلم نہیں۔ بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ ان کا جو اپنا راستہ موجود ہے۔ راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں۔ خدا اُن کو سربلند کرتا ہے وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں۔ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں"۔[۱۲]

ع۱۲ ٹریب پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۱۱

(۲) "انسان کی سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندانوں کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی۔ قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ تعبّد کی وحدت پر ایک عالمگیر اتحاد و اخوّت کی دعوت دی اور کہا کہ یا ایھا الناس انّا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" اے لوگو ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعۂ امتیاز نہیں۔ امتیاز اور شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفان پہاڑوں کی مرتفع چوٹیاں۔ زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔" ع۱۳

(۳) "یہ برادری (مسلمان) خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا۔ بمجرد اس اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری

ع۱۳ "الہلال" ۶ نومبر ۱۹۱۶ء بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۲۱۶/۲۱۷

ہو خواہ الجیریا کا وحشی خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندان کا عضو ہے جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔" ع۱۴

(۴) "ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت (وطنیت) اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح اور قومیں بھی لیکن مسلمان کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں ہے جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظِ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ بس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے۔ اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے وہ اثر صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں نیشن کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو خدا یا اسلام ہے۔" ع۱۵

(۵) "ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفرِ صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا۔ ورنہ اپنی پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہی ہندوؤں

ع۱۴ الہلال ۶ نومبر ۱۹۱۳ء بحوالہ "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ص ۲۳۰

ع۱۵ مضامینِ آزاد حصہ دوم بحوالہ وہی ص ۲۳۱

کی اقتدا کی ضرورت پیش آتی"۔ ع[۱۶]

اس عظیم شخصیت کا اسمِ گرامی ابوالکلام آزاد تھا جو ایک بہت بڑے عالمِ دین مولوی خیرالدین کے صاحبزادے تھے۔ مولوی خیرالدین درجن بھر بلند پایہ دینی و علمی کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ صاحبِ طریقت و ارشاد بزرگ تھے آپ کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ صرف کلکتہ اور بمبئی میں آپ کے معتقدین و مریدین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ ان کی وفات کے بعد ابوالکلام آزاد بھی کئی سال تک مسندِ سجادگی کی زینت بنے رہے۔ آزاد کے دورِ سجادگی کی ایک جھلک "من کیستم" کے مصنّف کی زبانی سنیئے۔

"بدایوں کے محلہ قاضی ٹولہ کے ایک مولوی منظور حسین تھے جو ہمارے ساتھ اسی بلڈنگ میں رہتے تھے اور سروے کے دفتر میں ملازم تھے یہ مولوی ابوالکلام آزاد کے بڑے پکے مریدوں میں سے ایک دن حسبِ معمول وہ میرے پاس آکر کہنے لگے کہ اب تو تمہارا امتحان ختم ہو چکا ہے یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو چلو حضرت (ابوالکلام) سے تمہاری ملاقات کرا دوں جن کی کرامت سے تم امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

مولوی ابوالکلام آزاد ایک بلند پایہ عالمِ دین محقق اور عظیم شخصیّت کے مالک تھے جب انہوں نے اپنا ہفت روزہ اخبار "الہلال" جاری کیا تھا تو مسلمان طبقہ میں ایک دھوم سی مچ گئی تھی اور ہندوستان کے شمالی و مغربی علاقوں میں ان کا نام گھر گھر پہنچ گیا تھا۔ ان کا اخبار "الہلال" مسلمانوں کے علمی و صحافی افق پر مہرِ زرنگار کی مانند طلوع ہو کر چمکا اور پھر جلد غروب ہو گیا۔ کیونکہ مولوی صاحب سیاست میں پڑ گئے۔ اور اس وجہ سے انہوں نے علمی فیض سے تمام مسلمانوں کو محروم کر دیا۔ مولوی صاحب

ع[۱۶] دہی ص ۲۳۱

کا گھرانہ متمول تھا اور ان کے بزرگوں کے وقت سے ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ کلکتہ میں ان کے مرید بے شمار تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ان (ابوالکلام آزاد) کے گرد بہت سے بنگالی مرید بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں مولوی صاحب جوان تھے۔ داڑھی کے بال خال خال تھے اور وہ دور سے ایک بڑی عمر والے لڑکے کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو بہت کم کرتے اور زیادہ تر خاموش سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کے لیے چائے آئی۔ پھر اُن کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر ہم لوگ بھی واپس چلے آئے۔ منظور حسین بدایونی مولوی صاحب کے اتنے گہرے عقیدت مند و جان فروش مرید تھے کہ اگر کبھی اُن سے ہمارا کوئی کام آپڑتا جس کے کرنے سے وہ انکار کرتے تو ہم انہیں ابوالکلام کی قسم دے کر وہ کام اُن سے کرا لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ ابوالکلام کا نام سن کر وہ سر و پا قدم ہر کام کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ خواہ وہ کام ان کی پسند کا ہوتا یا نہ ہوتا" ع۱۷

یہ ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے جب "من کیستم" کے مصنّف قریشی احمد حسین کلکتہ میں زیر تعلیم تھے۔ چوں کہ ابوالکلام ایک صوفی گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کی ابتدائی تحریروں میں اولیاء اللہ سے محبت اور اُن کا احترام جھلکتا ہے ایک مختصر سے اقتباس ملاحظہ ہو۔ وہ اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبّت الٰہی اور انقطاعِ ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے۔ اتنا ہی اُس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور نورِ ربّانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے اور ان کی روح فیضانِ الٰہی کے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیّت تک اس کا ارتفاع ہو جاتا ہے اور یہی صراطِ مستقیم اور دینِ قیّم کا آخری مرتبہ ہے۔ یہ وہ قانونِ ارتقا ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔ ع۱۸

ع۱۷ احمد حسین قریشی "من کیستم"، مطبوعہ کراچی نومبر ۱۹۷۲ء ص ۶۷ - ۶۶

ع۱۸ "الہلال" ۲۹ اگست ۱۹۱۴ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علما ص ۱۵-۲۱۴

یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جب ابوالکلام آزاد صاحب واردھا کے مکتب میں نہیں پہنچے تھے اور "ان الدین عند اللہ الاسلام" پر اُن کا پورا پورا یقین تھا اور وہ سب کچھ اسلام کی عینک سے دیکھتے تھے اور آزاد خیالوں کے نزدیک وہ مذہبی دیوانے تھے۔ گاندھویت کے پھندے میں پھنس کر ان پر کیا گزری اور بد قسمت مسلمان قوم ایک عظیم اور درد مند مفکر سے کس طرح محروم ہوئی۔ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں اُسے ہم کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

حضرت علامہ اقبال ۱۹۱۰-۱۱ء میں نہ صرف نظری طور پر ہی نظریہ "مسلم قومیت" کے مبلغ تھے بلکہ وہ اسی دور میں اس نظریہ کے "تمکن" کے لیے بھی کوشاں نظر آتے ہیں یعنی اس دور کی اُنکی ایک ایسی تحریر ہمیں ملتی ہے جس میں ایک ایسے خطہ ارضی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جہاں ان کے ہم قوم یعنی مسلمان اللہ رسول کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مذکورہ تحریر ملاحظہ ہو۔

"مذہب کو نظری علم کے کسی نظام میں محدود کر دینے کی کوشش یکسر غیر مفید ہے۔ جس نکتہ کو واضح کرنے کی، میں نے یہاں کوشش کی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام ہمارے لیے محض مذہب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہمارے لیے قومیت کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ نظریۂ اسلام ہی ہمارا گھر بار اور وطن ہے جس میں اسلامی اصولوں پر کاربند ہو کر ہی ہم زندہ رہتے ہیں، نشو و نما پاتے ہیں اور اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔" (ترجمہ) ع [19]

چوں کہ مسلم قومیت کا احیاء اور علاوہ اسلامی مملکت کا قیام حضرت علامہ کے پیشِ نظر تھا اور ان دونوں کے حصول کے لیے "جداگانہ نیابت" کا اصول بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک ہر اس تجویز اور مشورہ کی مخالفت کی جس میں "جداگانہ نیابت" کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ۱۹۱۶ء کا مسلم لیگ

ع [19] آل انڈیا ریویو مسلم سولائزیشن ۱۹۱۱ء

اور کانگرس پیکٹ (جو عام طور پر لکھنو پیکٹ کے نام سے مشہور ہے) تمام تر خامیوں کے باوجود حضرت علامہ کے لیے اس لیے قابلِ قبول تھا کہ اس میں پہلی دفعہ واضح طور پر جداگانہ نیابت کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا۔

۱۹۱۹-۲۰ء میں جب تحریکِ ہجرت۔ تحریک خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کا ہولناک طوفان اٹھا تو شروع شروع میں حضرت علامہ بھی خلافت کمیٹی پنجاب کے سکرٹری بن گئے لیکن جلد ہی انہوں نے کمیٹی کے دیگر ممبران کے نامعقول رویہ اور نامعقول سرگرمیوں کی وجہ سے اس سے استعفیٰ دے دیا۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" کے مصنّف لکھتے ہیں۔

"جہاں تک تحریکِ خلافت کا تعلق ہے ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ وہ خلافت کمیٹی پنجاب کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ لیکن اس عہدہ سے انہوں نے استعفا دے دیا۔ یہ روایت فقیر سیّد وحید الدین نے اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" جلد دوم میں درج کی ہے۔ فقیر صاحب نے لکھا ہے کہ "علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۱ء میں ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد سیالکوٹ میں وکالت کر رہے تھے اور تحریکِ خلافت میں حصّہ لے رہے تھے۔ اُن کے والد شیخ عطا محمد نے اپنے بھائی علامہ اقبال سے اس کا ذکر کیا تو اقبال نے انہیں بتایا کہ وہ بھی خلافت کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا کہ انہوں نے اس سے استعفاء دے دیا تھا۔ استعفاء کی وجہ انہوں نے یہ بتائی تھی کہ "خلافت کمیٹی کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن درباطن اخوان الشیاطین ہیں۔ اس استعفاء کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے لیکن اگر پیش کیے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۔" ع۲۰

ع۲۰ روزگارِ فقیر جلد دوم مصنفہ فقیر سیّد وحید الدین لائن آرٹ پریس کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۸۰ بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں لاہور ۱۹۷۷ء ص ۸۲

پنجاب خلافت کمیٹی کے سکرٹری بننے اور اس سے مستعفی ہونے کا ذکر حضرت علامہ کے ایک خط میں بھی ملتا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ یہ خط فقیر سیّد وحید الدین مرحوم اور محترم محمد احمد خاں صاحب کی نظروں سے کیسے اوجھل رہا ورنہ شیخ اعجاز صاحب کے بیان کا سہارا نہ لیتے۔ حضرت علامہ کے سکرٹری شپ سے مستعفی ہونے پر کئی احباب نے بُرا منایا۔ جن میں حضرت مولانا گرامی رحمتہ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ حضرت گرامی کی ناراضی اور اپنے استعفا کا ذکر حضرت علامہ نے اپنے ایک خط بنام خان نیاز الدین صاحب مرحوم بایں الفاظ کیا ہے۔

"گرامی صاحب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیجئے۔ سُنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفا دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو اُن کو حالات سے آگاہ کر دوں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا۔ اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا، ۱۱ر فروری ۱۹۲۰ء" ع ۲۱

حضرت علامہ کی بے شمار تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحریک عدمِ تعاون کے زبردست مخالف تھے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ایسی تحریروں کے موجود ہوتے ہوئے ڈاکٹر عبد السلام خورشید صاحب اور محمد حنیف شاہد صاحب وغیرہ کیسے انہیں عدم تعاون کا حامی ثابت کر رہے ہیں اس موضوع پر ہم انشاء اللہ اپنے مقالہ "اقبال اور تحریکِ عدمِ تعاون" پر تفصیل سے لکھیں گے۔

تحریکِ عدمِ تعاون یعنی ترکِ موالات سے حضرت علامہ کی مخالفت کی دو وجوہ تھیں۔

ع ۲۱ مکاتیبِ اقبال بنام نیاز الدین خاں مطبوعہ بزمِ اقبال لاہور ۱۹۵۴ء ص ۲۷

(۱) ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی صرف دو ہی جدید علوم کی درسگاہیں تھیں ایک علی گڈھ محمڈن کالج اور دوسری اسلامیہ کالج لاہور۔ یہ تحریک گاندھی کے بھرے میں آکر ان دونوں درسگاہوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دینی چاہتی تھی۔ اور بزعم خود اُس نے ایسا کر بھی لیا تھا۔ لیکن حضرت علامہ دل سے چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی حیلے یہ دونوں درسگاہیں ان نادان دوستوں کی یلغار سے محفوظ رہیں۔ اس زمانہ میں ہندوستان بھر میں جتنی تعلیمی درسگاہیں تھیں ان کی تفصیل مولانا سید سلیمان اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر شعبۂ علومِ اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اپنی تصنیف "النور" میں دی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "ہندوستان میں جس قدر کالج یا اسکول سرکاری ہیں اگرچہ نام و تنخواہ کا ان کے تعلق سرکار سے ہے لیکن دراصل ان کا فیض ہندوؤں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اختیارات وغیرہ کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں اس لیے تمتعات بھی اسی قوم کے حصہ میں ہیں۔ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین ۳ کالج ہیں علی گڑھ۔ لاہور اور پشاور میں۔ اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس ۱۲۵ ہے۔ تین مسلمانوں کے اور ایک سو بائیس ۱۲۲ ہندوؤں کے۔ اِن میں سے اگر سرکاری کالجوں کو جن کی کل تعداد چونتیس ہے الگ کر لیجئے جب بھی اٹھاسی ۸۸ کالج خالص ہندوؤں کے۔ ان میں بائیس ۲۲ کالج ایسے ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد قطعاً شامل نہیں اور چھیاسٹھ ۶۶ کالج ایسے ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد جاری ہے۔ تین اور اٹھاسی ۸۸ کی نسبت ذرا غور سے ملاحظہ کیجئے تو پھر تعلیم کے ملیامیٹ کر دینے کا فیصلہ کیجئے۔ سارے کالجوں میں مجموعی تعداد ہندوستانی طلباء کی چھیالیس ہزار چار سو سینتیس ۴۶۴۳۷ ہے جن میں سے مسلمان طلباء چار ہزار آٹھ سو پچھتر ہیں۔ ہندو طلبا کی تعداد اکتالیس ہزار پانچ سو باسٹھ ۴۱۵۶۲ ہے کہا جاتا ہے کہ

ہندو چوبیس ۲۴ کروڑ اور مسلمان سات ۷ کروڑ ہیں۔ اس تناسب سے جب کہ مسلمانوں کے تین ۳ کالج تھے۔ ہندوؤں کے بارے ہوتے۔ مسلمان طلبا کی تعداد کالجوں میں چار ہزار ۴۰۰۰ تھی تو ہندو سولہ ہزار ۱۶۰۰۰ ہوتے۔ لیکن جب کہ واقعہ نمونۂ عبرت پیش کر رہا ہو تو مسئلہ تعلیم کو تہ و بالا کرنے میں کس کا نقصان ہے۔ جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں سے صرف چار ہزار مشغولِ تعلیم ہوں اس قوم کا یہ ادعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں اگر خبط اور سودا نہیں تو اور کیا ہے۔ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں "رائے بے طاقت مکر و فسوں ست۔ طاقت بے رائے جہل و جنوں" ع۲۲

یہ تھے اُس زمانہ کے اسلامی تعلیمی اداروں اور زیرِ تعلیم طلبا کے اعداد و شمار۔ ان کا ہندو درسگاہوں کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیجیے تو اُن بزرجمہروں کی عقل و دانش پہ رونا آتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کی بایں تعلیمی زبوں حالی علی گڑھ اور لاہور کے مسلم تعلیمی اداروں کو نیست و نابود کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ان باکمال ہستیوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے جن کی ہمت و کوشش سے یہ تعلیمی درسگاہیں جزوی نقصان اٹھانے کے باوجود قائم و دائم رہیں۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت

(۲) ترکِ موالات سے حضرت علامہ کی عدم دلچسپی بلکہ کسی حد تک مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ اس طوفانِ بے محابا میں مسلمانوں کی ملی انفرادیت کی کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ مسلم قومیت کی بجائے ہندی قومیت کا دور دورہ تھا یہاں تک کہ ایک عظیم مسلمان رہنما کے نزدیک گاندھی کا درجہ "بعد از خدا و رسول بزرگ توئی" کا ہو گیا

ع۲۲ "النور" مرتبہ سید سلیمان اشرف مطبوعہ علی گڑھ بار اول ۱۹۲۱ء ص ۱۹۷-۱۹۶

تھا۔ قرآن اور وید ایک سطح پر آ گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان اپنی انفرادیت کھو کر ہندو اکثریت میں جذب ہو گئے ہیں یا ہو جائیں گے۔

جنگ عظیم سے بعد کی تحریکات اور ان کے اثرات کا جائزہ مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا میں یوں کھینچا ہے۔

"جنگِ عظیم کے دوران میں ایک جبرِ عظیم نافذ رہا۔ لیکن اُس کے ختم ہوتے ہی قومی آزادی کا ولولہ انگریز دشمنی کے ایک شدید جذبے کے ساتھ مل کر ایک سیلِ رواں کی صورت میں بہہ نکلا اور اپنی یلغار میں اُن بیشتر تعمیری میلانات کو بھی بہا لے گیا جنہیں سر سیّد کی تحریک نے جنم دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا انتشار۔ جامعہ ملیہ کا قیام۔ تحریکِ ہجرت۔ ترکِ تعلیم۔ ترکِ ملازمت اور عدمِ تعاون اس سیلابِ انقلاب کی چند یادگاریں ہیں جو جامعہ ملیہ کے سوا اس کے ساتھ بہتی ہوئی صحرائے عدم میں جا پہنچیں اور اس کی خشکیوں میں جذب ہو کر رہ گئیں" [ع۲۳]

تحریکِ عدمِ تعاون کا مسٹر گاندھی نے چورا چوری کے واقعہ کو بہانہ بنا کر بٹرا کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا خوش نما اور بظاہر مضبوط و مستحکم قلعہ "آناً فاناً" دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ ہندوؤں کے دلوں میں چھپے ہوئے نفرت کے شدید جذبات شدھی اور سنگھٹن کے روپ میں پوری شدت اور زور سے اُبھر آئے۔ ادھر مسلمانوں نے "دینِ محمدی" کی حفاظت و بقا کے لیے مرکزی مجلسِ تبلیغ قائم کی جس کے رہنماؤں اور بانیوں میں مولانا غلام بھیک نیرنگ اور مولانا عبد الماجد بدایونی جیسی فاضل اور مخلص ہستیاں شامل تھیں۔ حضرت علامہ اقبال اور دیگر دردمند مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی اس مجلس کیساتھ تھیں۔ (ایسے دردمند

ع۲۳ ماہنامہ ادبی دنیا لاہور۔ "تعلیمات اقبال" از مولانا صلاح الدین احمد اکتوبر ۱۹۵۰ء صہ ۶

مسلمانوں میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، مولانا نعیم الدین مراد آبادی اور مولانا محمد اسحاق حقانی کے اسمائے گرامی خصوصیت کے حامل ہیں۔ قادری)

مسلمانوں کی دلی ہمدردیاں بھی اس مجلس کے ساتھ تھیں۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ اپنے مضمون "اقبال کے بعض حالات" میں "تحریک تبلیغ اور اقبال" کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں "ہندوستان میں ہندوؤں کی جانب سے کم از کم ستر سال سے کبھی خفیہ، ...... کبھی اعلانیہ، کبھی انفرادی، کبھی منظم اور جماعتی سازشیں اور کوششیں ہوتی رہی ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کو مرتد کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل طویل ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسی سلسلہ کی ایک منظم اور اعلانیہ تحریک شدھی۔ آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹا وغیرہ اضلاع میں جاری ہوئی اور مسلمانوں نے اس حملہ کی مدافعت کے لیے ان شدھی زدہ علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے۔ اس زمانے میں جو تجربات و مشاہدات ہوئے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم نے یکم جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کو بہ مشورہ و امداد بعض اکابرِ ملت مثل حاجی مولوی سر رحیم بخش مرحوم، مولانا عبد الماجد بدایونی، نواب عبد الوہاب خاں مرحوم ایک مرکزی "جمعیت تبلیغ الاسلام" قائم کی جو بفضل تعالیٰ اب تک قائم ہے۔ چوں کہ اقبال کو تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا خاص شوق تھا۔ وہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء میں ہماری اس جمعیت کے ممبر ہو گئے۔ ع۲۴

حضرت علامہ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں حضرت علامہ اقبال کو اس تحریک سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں فرماتے ہیں "میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں

ع۲۴ میر غلام بھیک نیرنگ "اقبال کے بعض حالات"، سہ ماہی اقبال لاہور سنہ ۱۹۵۷ء

ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاست حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد، ہندوستان کے سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے اور میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے۔ اس کا اجر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ملے گا۔ آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔ مگر آپ اور مولوی عبد الماجد بدایونی جنوبی ہند کے دورہ کے لیے تیار رہیں"۔ [ع۲۵]

تحریکِ عدم تعاون کے بعد کے ۴/۵ سال ہندو مسلم فسادات اور مناقشات کی نذر ہو گئے۔ سیاسی سرگرمیاں کسی حد تک معطل ہو کر رہ گئیں۔

ایسے ہی حالات میں نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی۔ جس کی حضرت علامہ اقبال اور اسلامی ذہن و قلب رکھنے والے ہر مسلمان نے شدید مخالفت کی۔ مسلم لیگ جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکی تھی اور دو حصّوں میں بٹ چکی تھی۔ جناح لیگ اور شفیع لیگ ہیں۔ شفیع لیگ میں مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال جیسے نابغۂ روزگار حضرات شامل تھے۔ دوسری طرف جناح لیگ میں قائدِ اعظم کے علاوہ چند ایسے مسلمان لیڈر شامل تھے جو اب بھی ہندو مسلم اتحاد کی موہوم اُمید اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ حالانکہ نہرو رپورٹ کو دیکھتے ہوئے یہ "امید" ایک سراب سے زیادہ حیثیت نہیں

ع۲۵ مکتوب اقبال بنام غلام بھیک نیرنگ ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء، مکاتیب اقبال" ص ۲۱۱ - ۲۰۹ بحوالہ سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۴۲

رکھتی تھی۔ دونوں میں وجہ اختلاف خاص طور پر طریقۂ انتخاب تھا۔ علامہ اقبال اور ان کے ہم نوا جداگانہ انتخاب اور قائدِ اعظم اور ان کے ہم نوا مخلوط انتخاب کی حامی تھے، چوں کہ مسلم لیگ دو حصّوں میں بٹ کر کمزور ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی نمائندگی کے تنہا دعوٰی کی حق دار نہیں رہی تھی اس لیے اس کی جگہ اب آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے لے لی جو مسلم لیگ جناح گروپ۔ مسلم لیگ شفیع گروپ۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس اور آل انڈیا جمعیت العلماء پر مشتمل تھی۔ اس کانفرنس کا پہلا جلسہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی میں ہوا جس کی صدارت سر آغا خاں نے کی طبقۂ علماء میں سے مولانا عبدالماجد بدایونی (سنّی) مولانا آزاد سبحانی (سنّی) مولانا کفایت اللہ (دیوبندی) اور مولانا مہدی حسن مجتہد لکھنؤ (شیعہ) وغیرہ شامل تھے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جمعیت العلماء ہند، شروع میں سنّی اور دیوبندی دونوں مکتبہ ہائے فکر کے علماء[عـ] پر مشتمل تھی اور ہر ایسی تحریک و تجویز کی حمایت جو مسلم مفاد کے لیے ہو اس کے پروگرام میں شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نمائندے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے جلسوں میں شریک ہوتے اور مسلم مفاد کی حفاظت و بقا کے لیے کام کرتے لیکن جب ۱۹۳۰ء میں امروہہ[عـ۲۶] کے مقام پر مولانا حسین احمد دیوبندی اور مفتی کفایت اللہ اور انکے حامیوں نے جنکی جمعیت میں اکثریت تھی۔ یہ فیصلہ کیا کہ جمعیت آئندہ کانگریس کی پالیسی کی حمایت کریگی تو اسکے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ کانگریس کے مخالف حصّے نے "جمعیت العلمائے کانپور" (جسے "توسیع نظام علماء" بھی کہا جاتا ہے) کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کر لی۔ جس میں بقول رضوان احمد صاحب یہ علماء شامل تھے

"مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا غلام بھیک نیرنگ۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی۔ مولانا شفیع داؤدی۔ مولانا

عـ مگر علمائے اہلِ سُنّت کے اکثر مقتدر علماء اس سے ہمیشہ علیحدہ رہے، اُنکی دُور بین نگاہوں نے اس کے نتائج کو خوب سمجھ لیا تھا۔

عـ۲۶ اقبال کا [illegible]

مظہر الدین - مولانا عبد الماجد بدایونی - مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی - مولانا نثار احمد کانپوری - مولانا فاخر آلہ آبادی - مولانا نذیر احمد خجندی (شاہ احمد نورانی کے چچا) اور مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی (والد ماجد شاہ احمد نورانی) وغیرہم'' ع۲۷

چوں کہ جمعیت العلماء ہند کے بھی اب دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اس لیے اس کے بعد آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جلسوں میں کانگریس کے حامی ٹکڑے کی نمائندگی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کانگریس کے حامی علماء نے قیام پاکستان تک ماسوائے ۱۹۳۶ء کے چند مہینوں کے مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت نہ کی ان کا اوڑھنا بچھونا سب کچھ کانگریس اور ہندو مفاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے لاہور اور دہلی کے اجلاسوں میں صرف مسلم لیگ۔ خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء کانپور (توسیع نظام علماء) کو نمائندگی حاصل تھی۔ کانگریس کے حامی علماء کا کوئی نمائندہ ان اجلاسوں میں شامل نہ ہوا۔

۱۹ فروری ۱۹۳۳ء کو جب آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کا جلسہ وائٹ پیپر (قرطاس ابیض) پر جو گورنمنٹ نے شائع کیا تھا غور کرنے کے لیے ہوا تو جمعیت العلماء کانپور کے مندرجہ ذیل نمائندوں نے شرکت کی۔

۱۔ مولانا عبد الصمد مقتدری بدایوں

۲۔ مولانا عبد القدیر بدایوں

۳۔ مولوی غلام بھیک نیرنگ

۴۔ مولانا عبد الحامد بدایوں وغیرہم ع۲۸

ع۲۷ روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی اقبال ایڈیشن ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء

ع۲۸ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''روزنامہ اعمال'' جلد اول مصنفہ نواب سر محمد یامین خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء صفحات ۳۲۴ تا ۳۵۴

جب جمعیتہ العلماء ہند کی کانگرس نواز پالیسی کی وجہ سے مسلم مفاد کے حامی علماء نے جمعیتہ العلماء کانپور (اس جمعیت میں علماء کانپور۔ بدایوں۔ لکھنو اور علمائے بریلی شامل تھے) کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کر لی۔ تو اس تنظیم کا ایک نمائندہ اجلاس ۹/۵ اگست کو آلہ آباد میں ہوا۔ صدر جلسہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو خطبہ صدارت دیا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو "غرض کہ جمعیت علماء دہلی آزادئ کامل کے نصب العین سے دست بردار ہو کر فنا ہو چکی مگر الحمد للہ کہ علمائے کانپور۔ لکھنؤ۔ بدایوں وغیرہم کی جماعت اب بھی اپنے عہد پر قائم ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گی۔ بعض معترضین پست حوصلہ کی جانب سے اس اعلیٰ نصب العین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب فی الحال وہاں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو پھر اس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ذکر تو بیکار نہیں بلکہ بہت ضروری ہے اس لیے اگر نصب العین ہر وقت پیشِ نظر نہ رہے تو اس کے فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈومینین سٹیٹس کی بہر حال مخالفت کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ شے ہمارے مقصود یعنی آزادئ کامل کی درمیانی منزل یا اس کا جزو نہیں۔ بلکہ اس کے منافی اور مقابل واقع ہوئی ہے۔ اگر گاندھی جی ولایت پہنچ گئے۔ گول میز کانفرنس کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی اور ہندوستان کو درجۂ نو آبادیات مع تحفظات یا بلا تحفظات کسی طرح کا بھی مل گیا تو آزادئ کامل کا تخیل ختم۔ یا ایک عرصۂ دراز تک کے لیے خواب و خیال ہو جائے گا۔" ع ۲۹

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعیتہ العلماء کانپور نے اپنے اولین اجلاس ہی میں "آزادئ کامل" کی تجویز منظور کر لی تھی۔ بعد میں جب حضرت قائدِ اعظم کی لندن سے واپسی کے بعد مسلم لیگ اچھی منظم ہو گئی تو جمعیتہ العلماء کانپور نے اپنے کو مسلم لیگ میں ضم کر لیا کیونکہ دونوں

ع ۲۹ "حسرت موہانی" مرتبہ پروفیسر عبدالشکور مطبوعہ آگرہ ۱۹۴۶ء ص ۲۵-۲۶

کے مقاصد ایک تھے۔

نہرو رپورٹ کے زمانہ سے لے کر ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ حضرت علامہ اقبال کی زندگی کا مصروف ترین دور تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے باوجود خرابی صحت قوم کی عملاً" اور ذہناً" رہنمائی فرمائی۔ وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں اُن کی خموشی اور عافیت کوشی مسلمان قوم کو موت کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہے۔ اس دور میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں سر انجام دیے اُن کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اجمالاً یوں ہے۔

نہرو رپورٹ (جو مسلمانوں کی ملی انفرادیت کے لیے موت سے کم نہیں تھی) کی مخالفت۔ خطبہ آلہ آباد۔ خطبہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور۔ گول میز کانفرنسوں میں شرکت۔ قائدِاعظم کو لندن سے واپس بلانے کی کوشش۔ مسلم لیگ کو از سر نو منظم کرنا۔ باوجود خرابیٔ صحت پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنا۔ تحریکِ مسجد شہید گنج میں نمایاں کردار ادا کرنا۔ مولوی حسین احمد دیوبندی کے اسلام سوز اور اسلام کش نعرۂ وطنیت کی بھرپور اور مدلّل مخالفت وغیرہم ان تمام واقعات اور ہنگاموں کے دوران وہ تمام اصول اُن کے پیشِ نظر رہے ہیں جن پر وہ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک پورے تیس سال نہایت تندہی سے عمل پیرا رہے۔ وہ اصول یہ تھے۔

۱۔ مسلم قومیّت کا احیاء

۲۔ مسلم قومیّت کے تحفظ اور بقا کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا حصول۔

۳۔ نظریۂ "وطنیت" کی مخالفت (جو اس مقالہ کا خاص موضوع ہے)

۴۔ جداگانہ نیابت۔

ان کی اگر کسی سے دوستی تھی تو ان اصولوں کی حفاظت کے لیے اور اگر کسی سے عداوت تھی تو ان ہی اصولوں کی بنا پر۔ یہ ہے حضرت علامہ کی پوری سیاسی زندگی کا مختصر سا خاکہ اور اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جب تک حضرت علامہ کی پوری سیاسی

زندگی کو سامنے نہ رکھا جائے اُس وقت تک حضرت علامہ کے اس قطعہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

کا سمجھنا مشکل ہے۔ اب ہم اپنے اصل موضوع "معرکۂ اقبال و حسین احمد دیوبندی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) "اقبال کا سیاسی کارنامہ"، مرتبہ محمد احمد خاں مطبوعہ مرکزی اقبال اکادمی لاہور۔ ص ۱۷/۱۸

(۲) وہی ص ۲۰-۱۸

(۳) سرگذشتِ اقبال مرتبہ عبدالسلام خورشید اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۶۰

(۴) اقبال کا سیاسی کارنامہ محمد احمد خاں اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۸/۴۹

(۵) "نقوش"، لاہور ع ۱۲۳ اقبال نمبر ص ۸۲۴

(۶) ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور ص ۱۰۲/۱۰۳

(۷) خطباتِ اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو مطبوعہ دہلی ۱۹۴۶ء ۹۱ تا ۹۸

(۸) ایضاً ص ۹۱/۹۲

(۹) ایضاً ص ۹۲

(۱۰) ایضاً ۱۰۳ تا ۱۰۵

(۱۱) ماہنامہ "THE MINARET" کراچی جولائی ۱۹۷۴ء ۴۹/۵۰

(۱۲) تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد مطبوعہ لاہور ص ۲۱۱

(۱۳) ایضاً ص ۲۱۶/۲۱۷

(۱۴) ایضاً ص ۲۳۰

(۱۵) ایضاً ص ۲۳۱

(۱۶) ایضاً ص ۲۲۱

(۱۷) "من کیستم" مصنفہ قریشی احمد حسین مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء ص ۶۶/۶۷

(۱۸) تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۲۱۴/۲۱۵

(۱۹) ALL INELIA REPORT 1911

(۲۰) روزگارِ فقیر جلد دوم مرتبہ فقیر وحید الدین خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۸۰

(۲۱) مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۵۴ء ص ۲۷

(۲۲) "النور" مرتبہ سید سلیمان اشرف مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۱ء ص ۱۹۶/۱۹۷

(۲۳) ماہنامہ ادبی دنیا لاہور اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۶

(۲۴) "اقبال کے بعض حالات" از غلام بھیک نیرنگ سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۲

(۲۵) ایضاً ص ۲۴

(۲۶) اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں۔

(۲۷) روزنامہ "جنگ" راولپنڈی اقبال نمبر ۲۱ / اپریل ۱۹۶۸ء۔

(۲۸) "نامہ اعمال" مرتبہ نواب سر محمد یامین خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء جلد اوّل ص ۳۲۴ تا ۳۳۵

(۲۹) حسرت موہانی مرتبہ پروفیسر عبدالشکور مطبوعہ آگرہ ۱۹۴۶ء ص ۲۵/۲۶

دوسرا باب

(۱) جیسا کہ ہم پہلے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ اوائل ہی سے ہندی قومیت (متحدہ قومیت) کے نظریہ کے سخت خلاف تھے اُن کی زندگی کا مقصدِ وحید مسلم قومیت کا احیاء اور دینِ مصطفےٰ کی عزت و آبرو کو قائم اور بحال رکھنا تھا۔ اُن کی پوری سیاسی زندگی میں جو تیس سال کو محیط ہے ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب انہوں نے اپنے مسلک اور نظریہ کو پسِ پشت ڈالا ہو۔ اس نظریہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" سے ان کے کان ابتدا ہی سے آشنا تھے۔ جہاں ہندو من حیث القوم اور چند ناعاقبت اندیش مسلمان لیڈر اس نظریہ کے مبلغ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے وہاں حضرت علامہ اور دوسرے دردمند مسلمان اس نظریہ کی تردید میں مسکت بیانات و تحریریں شائع کر رہے تھے۔ لیکن جب ایک عظیم اسلامی درسگاہ کے صدر مدرس مولوی حسین احمد نے یہ نعرہ[۱] بلند کیا تو حضرت علامہ کو دلی رنج ہوا۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک تو یہ کہ مولوی صاحب اپنے مکتبۂ فکر کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اُن کا حلقۂ اثر بھی کافی وسیع تھا اور ان کے اس مسلک یا نظریہ کا اُن کے زیرِ اثر علماء و عوام پر اثر پڑنا لازمی تھا جیسا کہ بعد میں ہوا بھی۔ دوسرے حضرت علامہ کو دارالعلوم دیوبند سے بڑی امیدیں تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ جب بھی قوم کو ضرورت پڑی تو یہ دارالعلوم سوادِ اعظم کے ساتھ مل کر قوم کے مفاد کے لیے ہراول دستہ کے طور پر کام کرے گا لیکن ان کی اُمیدوں اور آرزوں کے برعکس مولوی صاحب اور اُن کے ہم نوا مسٹر گاندھی کے

۱ے مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم ص ۱۲۳ بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں ص ۵۶۹

اشارۂ ابرو پر دین و ایمان نثار کر رہے تھے اور اس باطل نظریہ کو "حق" ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث میں تاویلیں کی جا رہی تھیں۔ عجیب عجیب بے سر و پا دلائل تراشے جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں اگر حکیم الامت علامہ اقبال کا دردمند دل تڑپ اٹھا تو کوئی انہونی یا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

(۲) ہم پچھلی سطور میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ نظریہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"، کوئی نیا نظریہ نہیں تھا بلکہ پون صدی سے ہندو رہنما (تلک۔ گاندھی۔ موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ) اور اُن کے مسلمان ساتھی (سید محمود اور ابوالکلام وغیرہ) اس نظریہ کا پرچار اور تبلیغ کر رہے تھے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معرکۂ اقبال و حسین احمد کی بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے چند آزاد خیال اور نسبتاً غیر متعصب ہندو رہنماؤں کے اُن فرمودات عالیہ کا نقشہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے جو وہ ہندو مت کے احیاء اور مسلم قومیت کو ختم کرنے کے لیے آئے دن پریس میں دے رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک فراخ دل اور وسیع النظر ہندو رہنما مسٹر گاندھی کے ارشادات متحدہ قومیت کے بارے میں ملاحظہ ہوں۔ (ا) "وہ ایک نیک کام میں مسلمانوں کی مدد کرنا ہندوستان کی خدمت کرنا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی خون سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ایک ہی ماں (بھارت ماتا) کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں"۔ ع۲

یہ بیان ۱۹۲۱ء کا ہے اس سے پورے اُنیس سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

(ب) "وہ عملی زندگی میں ہم دونوں کو (ہندو۔ مسلمانوں) دو جدا گانہ قوموں میں تقسیم کرنا

ع۲ ینگ انڈیا ۲۸ رجولائی ۱۹۲۱ء بحوالہ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۱۹۲

ناممکن ہے۔ ہم دو مختلف قومیں نہیں ہیں۔ ہر مسلمان اگر اپنے خاندان کی تاریخ میں دور تک پیچھے جائے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام ہندو نام ہے۔ ہر مسلمان دراصل ہندو ہی ہے جس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ایسا کرنے سے کوئی جداگانہ قومیت تو پیدا نہیں ہوتی۔" ع۳

(ج) "میں ہندو دھرم کے بارے میں اپنے جذبات کو الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح جیسے اُن جذبات کو بیان نہیں کر سکتا جو میں اپنی بیوی کے بارے میں رکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ میری بیوی میں خامیاں نہیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے ایک ایسے رابطے کا احساس ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہی احساس ہندو دھرم کے بارے میں اس کی خامیوں اور کمیوں کے باوجود رکھتا ہوں۔ میں شدت سے مذہبی اصلاح کا حامی ہوں لیکن میرا یہ جوش کبھی اس حد تک نہیں پہنچتا کہ میں ہندو دھرم کے بنیادی ارکان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دوں۔" ع۴

مسٹر گاندھی کے اس نظریہ "یہ کہ مسلمان خونی رشتہ کے لحاظ سے ایک ہیں"، جو لوگ زیادہ متاثر ہوئے اُن میں نمایاں نام مولوی عبید اللہ سندھی کا ہے جس کا ذکر آگے اپنے مقام پر آئے گا۔

مسٹر گاندھی ہندی آریائی تمدن کے اتنے زیادہ مبلغ تھے کہ اُن کے ایک مسلمان عقیدت مند کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ تلخ حقیقت قبول کرنی پڑی۔ کانگرس

ع۳ ہریجن ۶/ جون ۱۹۴۷ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۱۹۵

ع۴ ینگ انڈیا ۶/ اکتوبر ۱۹۲۱ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۱۹۶

کے ترجمان رسالہ "جامعہ"، دہلی کے ایڈیٹر لکھتے ہیں "اس میں شک نہیں مہاتما گاندھی ہندو آریائی تمدّن کا احیاء چاہتے ہیں لیکن، ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامّل نہیں ہونا چاہیئے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ان کی جد و جہد، اُن کا خلوص، اُن کا ایثار، اُن کی غریب دوستی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ہندو آریائی تمدن سے شدید وابستگی اور محبت کی وجہ سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اتنی کوشش نہیں کر سکے جتنی انہیں کرنے کا موقع تھا"۔ ع۵

یہ ہیں ہندوؤں کے سب سے زیادہ فراخ دل اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست ہندو لیڈر کے خیالات۔ اب ایک اور معتدل ہندو رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالاتِ عالیہ سنیئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(ا) "ہندوستان میں مسلم قومیّت پر زور دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر دوسری قوم موجود ہے جو یک جا نہیں ہے منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعیّن ہے، اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیّل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بالکل دور از کار ہے۔ مسلم قومیّت کے ذکر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی رشتہ ہی ایک چیز ہے۔ اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیّت نشو و نما نہ پا سکے"۔ ع۶

(ب) "ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں۔ گویا دو ملتوں یا دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال

ع۵ رسالہ "جامعہ" دہلی جولائی ۱۹۳۶ء ص ۶۴۵

ع۶ میری کہانی جلد دوم خود نوشت جواہر لال نہرو ص ۳۳۱ بحوالہ سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مودودی بار سوم ص ۴۴

کی گنجائش نہیں - آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے"۔ ع۷

(ج) جس چیز کو مذہب یا منظّم مذہب کہیئے اُسے ہندوستان میں دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ (مذہب) اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصّب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کی بقا کا حامی ہے"۔ ع۸

(د) مسلم قوم کا تخیّل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کا اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"۔ ع۹

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کے ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں "جدید ہندی قومیّت کا لیڈر وہ شخص ہے جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے۔ ہر اُس قومیّت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی

ع۷ خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کانفرنس پنڈت نہرو۔ بحوالہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم از مودودی ص ۴۷

ع۸ میری کہانی مرتبہ پنڈت نہرو بحوالہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم از مودودی ص ۴۸

ع۹ میری کہانی مرتبہ پنڈت نہرو بحوالہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم از مودودی ص ۵۶

نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے۔ مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ ان سے صاف کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے، داڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا۔ (تلخیص)" ع[۱۰]

جواہر لال نہرو صاحب کے یہ ارشادات ۳۷-۱۹۳۶ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب نہرو صاحب کے والد پنڈت موتی لال نہرو یعنی بڑے میاں کی بات بھی سنیئے "یہ ایجی ٹیشن بالکل بے بنیاد ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں ایسا ہی ہندو ہوں جیسے خود پنڈت مالوی ہیں۔ میں ایک آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خود کانگریس ہندو جماعت ہے۔ اس میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں تھوڑے سے مسلمان شامل ہو گئے تھے ورنہ ابتداء سے یہ ہندو جماعت ہے۔" ع[۱۱]

یہ چند بیانات آزاد خیال ہندو لیڈروں کے ہیں اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ متعصب اور متشدد ہندوؤں نے اپنی تحریروں اور بیانوں میں کیا کیا گل کھلائے ہونگے اصل میں ہر ہندو "ہندو آریائی تمدن" کا ترجمان چاہے آزاد خیال ہو چاہے مہاسبھائی۔

ع[۱۰] مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول مرتبہ مولانا مودودی ص ۱۸/۱۹

ع[۱۱] اخبار "شیر پنجاب" لاہور ۱۹ ستمبر ۱۹۲۲ء بیان موتی لال نہرو بحوالہ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی مرتبہ منشی عبدالرحمٰن ص ۳۳

حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ ابو الکلام آزاد اور مولوی حسین احمد دیوبندی ان شکر چڑھی گولیوں کو کیسے نگل گئے۔ نہرو نے ان سادہ لوح علماء کو اس حد تک باور کرا دیا تھا کہ تم مسلمان سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو اور تمہارا علیحدہ قومی شخص محض برطانوی سامراج کے ایجنٹوں کا پراپیگنڈہ ہے۔

(۳) جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولوی حسین احمد صاحب دیوبندی کے مذکورہ بیان "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" سے حضرت علامہ کو جو ذہنی اور قلبی تکلیف ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی صاحب دیوبندی مکتبۂ فکر کے ایک معمولی عالم نہیں بلکہ گلِ سرسبد تھے اور خطرہ تھا کہ مولوی صاحب کے نظریہ کو علمائے دیوبند من حیث الجماعت اپنا لیں گے اور اس طرح مسلمان مزید مشکلات اور الجھنوں میں مبتلا ہو جائیں گے اس خیال کا اظہار میرے مکرم دوست سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور" حصّہ اول بار اول کے صفحہ ۲۵۶ پر بھی کیا ہے۔ حضرت علامہ کا خیال اور خطرہ درست نکلا۔ دیوبندی علماء (باستثناءِ چند مثلاً مولوی اشرف علی تھانوی۔ محمد شفیع مفتی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولوی خیر محمد جالندھری مولوی اطہر علی اور مولوی شبیر علی صاحب وغیرھم) کانگرس کے ہمنوا اور مسلم لیگ کے جانی دشمن بن گئے۔ یہاں تک کہ وہابی اور سُنّی کی اصلاحیں چل گئیں۔ وہابی کے اصطلاحی معنی کانگرس کا ہمنوا اور سُنّی کے مسلم لیگ کا طرفدار ہونے کے رہ گئے۔ اس کی توجیہ سید نیازی صاحب نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور" میں اس طرح کی ہے۔

"یہ محض اتفاق ہے کہ لیگ جس متحدہ محاذ کی خواہاں تھی اس کے مخالفین کو وہابی اور اہلِ حدیث کہا جانا ورنہ سوال اہلِ حدیث کا تھا نہ وہابیت کا۔ لیکن اختلاف اور انتشار کے اس تکلیف دہ زمانے میں جب مسلمان الگ الگ حلقوں میں بکھر گئے تھے۔ بعض الفاظ نے اصطلاحات کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کا اطلاق صرف خاص خاص حلقوں

پر ہوتا وہابیت یا دیوبندیت کا کانگریس کے طرفدار علما اور اُن کے عقیدت مندوں پر۔ مولانا حسین احمد کانگریس کے حامی تھے۔ مولوی ثناء اللہ مرحوم مدیرِ اہلِ حدیث امرتسر بھی "ملکی مطلع" کے زیرِ عنوان جب سیاستِ حاضرہ پر تبصرہ فرماتے تو اس سے بھی کانگریس کی حمایت کا پہلو نکلتا۔ مولانا داؤد غزنوی کا شمار بھی زعمائے کانگریس میں ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اہلِ حدیث ہی کا رکنِ رکین تصوّر کیا جاتا تھا۔ انہیں بھی جماعت اہلِ حدیث کی تائید حاصل تھی لہٰذا عام خیال یہ تھا کہ اہلِ حدیث باعرفِ عام میں وہابی لیگ کے خلاف ہیں" ع ۱۲

یہی نہیں بلکہ لیگ کے مخالفین وہابی حضرات کو یہ کہہ کر بھکا رہے تھے کہ چوں کہ حنفی لیگ کے حامی ہیں انہیں کانگریس کی حمایت کرنی چاہیے۔ سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت علامہ نے کسی قدر افسردہ خاطر ہو کر فرمایا "افسوس ہے مسلمانوں کی اکثریت کو حنفی قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ غیر حنفی کانگریس کی طرف جھک جائیں۔ حالانکہ سوال نہ شیعیت کا ہے نہ حنفیت، نہ وہابیّت کا سوال فقط اسلام کا ہے" ع ۱۳

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا حسین احمد کے نظریے سے جو لوگ متاثر ہوئے ان میں مولانا شبلی نعمانی کے ذہین وفطین جانشین علاّمہ سلیمان ندوی بھی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ زبردست پراپیگنڈے کے باوجود مسلمان کانگریس میں شامل ہونے سے ہچکچا رہے ہیں تو انہوں نے "الانصاری" میں ایک بیان شائع کیا جس میں لکھا "اس وقت تین ہی صورتیں ہیں، یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک

ع ۱۲ "اقبال کے حضور" مرتبہ سید نذیر نیازی بار اوّل ص ۲۶۲/۲۶۳

ع ۱۳ "اقبال کے حضور" مرتبہ سید نذیر نیازی بار اوّل ص ۲۶۹

مانگتے پھریں یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں (یہ مسلم لیگ کی طرف اشارہ ہے) اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج (یعنی کانگریس) سے مالِ غنیمت میں جھگڑا کریں یا یہ کہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے لیے جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں۔" عـ۱۴

ندوی صاحب کے اس طنزیہ بیان پر مولانا مودودی صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں ملاحظہ ہو "غور کیجیے یہ ارشادِ گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے۔ مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب ٹھٹکے کھڑے ہیں (مودودی صاحب کا یہ تجزیہ بالکل غلط ہے۔ سید نور محمد قادری) اس کی وجہ کچھ اور نہیں محض بزدلی ہے۔ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینی بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی جو ظاہر ہے اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں۔ شیروں کی طرح شکار مار لیں گے تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آ کر حصّہ بٹانے کی کوشش کرے گی یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہنِ سامع میں بنتی ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ وہ شیرانِ بیشہ، حریت ہیں جو تمام ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں اور پھر یہ جنگ آزادی کس قدر پاک کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے۔ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں۔ ایسی پاک جنگ ایسے مقدس جہاد میں حصّہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان

عـ۱۴ "الانصاری دہلی ۳ رمضان ۱۳۵۶ھ / ۷ نومبر ۱۹۳۸ء بحوالہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم از مولانا مودودی ص $\frac{18}{19}$

بزدل، دور ہمت اور کمینہ ہیں ۔" ع۱۵

(۴)

چند لازوال اشعار

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ایک عالم دین کی زبان سے غیر اسلامی اصطلاح "ملت از وطن است" کا نعرہ سن کر حضرت علامہ کو از حد صدمہ ہوا۔ آخر اس کسک اور اضطراب نے ایک لازوال شعری قطعہ کی شکل اختیار کر لی - ۲۸ر جنوری ۱۹۳۸ء کی صبح کو سید نذیر نیازی حضرت علامہ کے حضور حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا نیازی صاحب تین شعر ہیں بیاض میں درج کر دو۔ نیازی نے کہا ارشاد فرمایئے۔ حضرت علامہ دردمند آواز سے گویا ہوئے۔ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است　　　چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است ع۱۶

اس قطعہ عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ الخ کے علاوہ اس موضوع پر حضرت علامہ نے اور بھی اشعار کہے ہیں جو عام قارئین کی نظر سے اوجھل ہیں ملاحظہ فرمائیں ؎

ندانی نکتۂ دینِ عرب را　　　کہ گوئی صبحِ روشن تیرہ شب را

اگر قوم از وطن بودے محمد صلی اللہ علیہ وسلم　　　نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

(اقبال کے حضور ص ۱۶۲)

ع۱۵ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مولانا مودودی ص ۱۹

ع۱۶ "اقبال کے حضور" مرتبہ سید نذیر نیازی ص ۱۲۶ - ۱۲۵

؎ حق را بفریبد کہ نبی را بفریبد آں شیخ — کہ خود را مدنی خواند

(اقبال کے حضور ص ۱۴۷)

کچھ دنوں کے بعد یہ اشعار اخبارات میں شائع ہو گئے۔ ان کا چھپنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا گویا جنگل میں آگ لگ گئی حضرت علامہ کی ذات اور نظریات کے خلاف اور مولانا کی حمایت میں اخبارات و رسائل میں مضامینِ نثر و نظم کے انبار لگ گئے۔

سیّد نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں "یہ قطعہ اشعار "ارمغانِ حجاز"، میں موجود ہے اور اس کی اشاعت پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ معترضین نے اس قطعہ پر قطعے لکھے۔ اخباروں میں مضامین شائع ہوئے پمفلٹ چھاپے گئے۔ لیکن آج یہ سب بادِ ہوا ہو چکی ہیں نہ کسی کو قطعات کا علم ہے نہ مضامین اور پمفلٹوں کا ان قطعوں اور پمفلٹوں میں کوئی جان تھی نہ روح۔ برعکس اس کے حضرت علامہ نے ایک حق بات کہی تھی اور حق اپنی جگہ پر آج بھی قائم ہے۔ ع۱۷

حضرت علامہ کے اس قطعہ کے خلاف لکھنے والوں میں مشہور نقاد ڈاکٹر شوکت سبزواری اور مولوی اقبال احمد سہیل جیسی فاضل ہستیاں بھی آنکھیں بند کر کے شامل ہو گئی تھیں۔ سہیل صاحب کی نظم بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کے چند آبدار موتی یہ ہیں ؎

معاذ اللہ کہ بشیخ الحدیث خردہ گرفت سبک بچشم فرو زیں سباب بے ادبی است

بیانِ او ہمہ تحقیق و بحث در تفسیر زبانِ او عجمی و کلام در عربی است

کہ گفت بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است دروغ گوئی ایراد ایں چہ بوالعجبی است

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است کہ مستفادِ فرمودہ حضرت نبی است

ع۱۷ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی ص ۱۲۶

زبانِ طعن کشودی مگر نہ دانستی
کہ فرقِ ملّت و قوم از لطائفِ ادبی است

خدائے گفت بقرآں لِکُلِّ قوم "ہاد"
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

رموزِ حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن
تلاشِ لذّتِ عرفاں زبادۂ عنبی است

بہ دیوبند گزر گر نجات می طلبی
ز دیو نفس سطح شورد دانشں توابی ست

بگیر راہِ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را وہم ز آلِ نبی است"[۱۸]

یہ پوری نظم مکتوباتِ شیخ الاسلام میں شامل ہے اور اس نظم کے شروع میں مکتوبات کے مرتب نجم الدین اصلاحی صاحب نے ایک مفصل نوٹ بھی لکھا ہے جس کی تلخیص بلاحظہ ہو۔ ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم (علامہ اقبال) کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے ان کا کلام بغور پڑھا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ مرحوم کے جہاں سینکڑوں اور ہزاروں اشعار مفید ہیں وہیں اُن کے کتنے اشعار ایسے ہیں جن سے کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفہ پر اس کی زد پڑتی ہے۔ اگر زمانۂ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں یا متحدہ قومیت کا نظریہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اسلام کے مطابق نہ تھا تو اس سے کہیں کھلی ہوئی گمراہی کی تبلیغ موصوف کے اس شعر میں کیا موجود نہیں ہے۔

۵ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو امام ابوحنیفہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا رتبہ دے

---

۱۸ مکتوباتِ شیخ الاسلام مرتبہ نجم الدین اصلاحی بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ جبیب احمد ص ۲۷۳ - ۲۷۲

دیا جائے تو پھر بھی کم ہے مگر ہم ہندی طالب علموں کے نزدیک تو ڈاکٹر صاحب کا وہی مقام ہے جو علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم کا ہے۔ لیکن جہاں تک شاعری اور وہ بھی اُردو فارسی شاعری کا درجہ ہے سہیل صاحب کا مقام ان (یعنی علامہ اقبال) سے بہت زیادہ بلند ہے۔" (ملتقط) ع۱۹

سہیل صاحب کی مذکورہ نظم پر ماہنامہ حقیقتِ اسلام لاہور کے ایڈیٹر نے اپنے اداریہ "حال و قال" میں مفصل تبصرہ کیا ہے جس کا اقتباس بھی یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی اور افادیت نہیں ہوگا۔ ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں "جو لوگ متحدہ قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں اور اس کا پرچار بھی دن رات کرتے رہتے ہیں ان میں یہ نہ سمجھیئے کہ محض مغربی جادو کا شکار نوجوان ہی ہیں جو نئی تعلیم کے فیض سے یورپ سے آئی ہوئی ہر چیز کو اچھا سمجھنے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اشتراکیت وغیرہ کو پسند کرنے کے جذبہ کے طفیل مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے ہیں بلکہ قہر تو یہ ہے کہ اس صف میں چند علماء بھی پیش پیش ہیں جو وارثانِ دینِ نبوی کہلاتے ہیں ہم ان بزرگواروں کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ ایک طرف ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ

ع بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

مگر اس کے مقابلے میں ایک شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ

ع برو براہِ حسین احمد ار خدا خواہی

یعنی اگر تجھے خدا چاہیئے تو حسین احمد کی راہ پر چل۔ اگر مقابلہ میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس نام نہ لیا گیا ہوتا۔ جن کے مقدس قدم کی خاک کا تاج بھی اگر حسین احمد کو میسر ہو جائے تو جبھی وہ حسین احمد ہو سکتا ہے۔ تو شاید یہ کہنا برداشت بھی کر لیا

ع۱۸ اسے کہتے ہیں تنقیدِ نمید

ع۱۹ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۲۷۱/۲۷۲

جاتا۔ مگر اب اسے برداشت وہی کر سکتا ہے جسے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت نہیں۔ غور کیجئے اگر اس طرح کا تقابل کوئی غیر مسلم کرتا تو مسلمان کتنے بھڑکتے مگر خود مسلمانوں اور خصوصاً ان کے پیشواؤں پر سب راہیں کشادہ ہیں جو چاہیں کریں۔" ع۲۰

حضرت علامہ کے مندرجہ بالا قطعہ کی تائید و تردید میں لکھی ہوئی تحریروں سے جب مولانا حسین احمد صاحب کا رہا سہا بھرم بھی کھلنے لگا تو ان کے ایک دیوبندی عقیدت مند مولوی عبد الرشید نسیم طالوت نے مولوی صاحب کو بذریعہ خط سمجھایا کہ بڑے میاں ہوش کے ناخن لو کس الجھن میں پھنستے جا رہے ہو کوئی ایسی تحریر کسی نہ کسی بہانے شائع کر دو یا کروا دو جس سے اس جھاڑ کے کانٹے سے تمہاری گلو خلاصی ہو سکے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے طالوت صاحب کو ایک مفصل خط لکھا جو متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور کے ۹ صفحات (ص ۳ تا ۱۱) پر پھیلا ہوا ہے۔

لیکن اس خط کے مندرجات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دی جائے کہ وہ کوئی غیر جانب دار شخصیت نہیں تھے جیسا کہ انہوں نے اپنے خط بنام علامہ اقبال میں ظاہر کیا ہے بلکہ وہ خود بھی مولوی حسین احمد صاحب کے ہم نوا و ہم پیا تھے طالوت صاحب کے متعلق سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں "مولانا حسین احمد کے طرف دار تھے قوم اور وطن کی بحث میں اکثر اخباروں میں کوئی نہ کوئی مضمون لکھتے رہتے اُن کا کہنا تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کا مؤقف یہ نہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں بلکہ یہ کہ بہ حالت موجودہ جو بھی قوم ہے اُس کی اساس قومیت جغرافیائی ہے یا وطنی۔" ع۲۱

ع۲۰ ماہنامہ "حقیقت اسلام" لاہور ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۲ و ۳

ع۲۱ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۰۷

مولوی صاحب نے مذکورہ خط طالوت صاحب کو ۸ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۹ر فروری ۱۹۳۸ء کو لکھا اور ساتھ ہی یہ خط اپنے ہم خیال احباب سے مشورہ کر کے مختلف اخبارات و رسائل مثلاً "مدینہ"، "الجمعیتہ"، "انصاری"، "ہند جدید"، "ترجمانِ سرحد"، "پاسبان"، "اجمل" وغیرہ کو شائع کرنے کے لیے جاری کر دیا۔ خیر جب یہ مفصل اور طویل خط طالوت صاحب کو ملا تو انہوں نے اس کے مفید مطلب اقتباسات نقل کر کے اپنے خط کے ہمراہ حضرت علامہ کو ارسال کر دئے تاکہ مولوی صاحب کی پوزیشن کو صاف کیا جا سکے۔ لیکن حضرت علامہ کو طالوت صاحب کا خط ملنے سے پہلے ہی مولوی صاحب کا بیان پریس میں آچکا تھا جو حضرت علامہ اور اُن کے دوستوں کی نظر سے گزر چکا تھا۔ مولوی صاحب نے اس بیان میں اپنے فرمودہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کی مولویانہ تاویلیں کی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے الفاظ کا وہ مطلب یا مفہوم نہیں تھا جو علامہ اقبال سمجھے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ "۸ ریا ۹ جنوری کے "انصاری" اور "تیج" ملاحظہ فرمائیے میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب و ملّت کا دار و مدار وطنیّت پر ہے یہ بالکل افترا اور دجل ہے "احسان" مورخہ ۱۳ر جنوری کے صفحہ ۳ پر بھی میرا قول یہ نہیں بتایا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ قوم یا قومیّت کی اساس وطن پر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی غلط ہے مگر یہ بھی ضرور تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب اور ملّت کا مدار وطنیّت پر ہونا میں نے نہیں کہا تھا شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسے افترا اور اتہام کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس قسم کی تحریفیں اور سبّ و شتم ان کے فرائضِ منصبیہ میں سے ہیں مگر سر اقبال جیسے مہذب اور متین شخص کا اُن کی صف میں آجانا ضرور تعجب خیز امر ہے۔ اُن سے میری خط و کتابت نہیں مجھ جیسے ادنیٰ ترین ہندوستانی کا اُن کی بارگاہِ عالی تک پہنچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اگر غیر مناسب نہ ہو تو اُن کی

عالی بارگاہ میں یہ شعر ضرور پہنچایئے ؎

ھنیئاً مریئاً غیر داءٍ مخامرٍ ۔۔۔ لعزۃ من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھ دار اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بنا پر یہ اخبار ہر قسم کی ناجائز اور ناسزا کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور میں نہ کرنا چاہیئے اور سر اقبال موصوف جیسے عالی خیال، حوصلہ مند، مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا نہ تحقیق کرنے کی توجہ فرمائی آیہ "ان جاءکم فاسق نبباء فتبیّنو الایۃ" گویا نظر سے نہیں گذری سر اقبال فرماتے ہیں ؎

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمّد عربی است

کیا انتہائی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملّت اور قوم کو سر اقبال صاحب ایک قرار دے کر ملّت کو وطنیت کی بنا پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیّت کو بھی اس سے منزّہ قرار دیتے ہیں یہ بوالعجبی نہیں ہے تو کیا ہے زبانِ عربی اور مقامِ محمّد عربی علیہ السّلام سے کون بے خبر ہے میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیّت کا کہا ہے ملّت کا نہیں دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ملّت کے معنی شریعت یا دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں۔" ع۲۲

اس اقتباس میں مولوی صاحب نے اپنے دو خاص مولویانہ حربے استعمال کیئے ہیں۔ ایک تو مسئلہ کو اُلجھانے کے لیے ملّت اور قوم کی بے سود نئی بحث چھیڑ دی ہے اور دوسرے اپنے خاص انداز میں حکیم الامت علامہ اقبال پر چوٹیں کی ہیں۔ کہیں تو انہیں شملہ کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والوں میں شمار کیا ہے اور کہیں زبانِ عربی اور مقامِ محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بے خبر قرار دیا ہے۔

اب ذیل میں ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اقتباس طالوت صاحب

ع۲۲ متحدہ قومیّت اور اسلام از مولوی حسین احمد مطبوعہ مکتبہ محمودیہ لاہور ص ۵ تا ۶

نے اپنے خط بنام حضرت علامہ میں شامل نہیں کیا کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو اُن کی سکیم اور اُن کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ اس اقتباس میں بلّی اپنے تھیلے سے بالکل باہر نکل آئی ہے اور مولوی صاحب نے کھل کر متحدّہ قومیت کی وکالت کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ "ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں" ملاحظہ ہو۔

طالوت صاحب کو مخاطب کر کے مولوی صاحب لکھتے ہیں "میرے محترم اس اجنبی اور خود غرض حکومت اور پردیسی خون چوسنے والی قوم نے جس قعرِ مذلت اور ہلاکت اور قحط و افلاس کے تیرہ و تاریک گڑھے میں تمام ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً عرصۂ دراز سے ڈال رکھا ہے اور جس طرح وہ ہندوستانیوں کو روز افزوں فنا کے گھاٹ اتارتی جا رہی ہے وہ اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔ نیز اس سے آزاد ہونا اور ملک و ملت کی زندگی اور بہبودی کی فکر اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سبھوں کا فریضہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہے۔ اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور ذرائع بھی عقلاً ممکن ہیں مگر جس قدر قوی اور مؤثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے آگے حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بیکار ہیں اور بغیر نقصان عظیم ہندوستانی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور اس کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ کانگرس نے ابتداء ہی سے اس امر کو اپنے اغراض و مقاصد میں داخل کیا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب کہ

کانگریس کا اوّلین اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا "ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق اور متحد کر کے ایک قوم بنایا جائے" ع۲۳

(۷) مولوی صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے چھپنے سے پہلے ہی حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسا مضمون لکھنے کے لیے ذہناً تیار تھے جس میں مولوی صاحب اور اُن کے ہم نواؤں کی طرف سے اٹھائے ہوئے اعتراضات اور اُن کے ذہنی مغالطوں کا مفصل اور مدلّل جواب دیا جائے لیکن یہ بیان چھپنے کے بعد ایسا کرنا "لابد" کی حیثیت اختیار کر گیا۔ سیّد نذیر نیازی صاحب اس کیفیّت کو یوں بیان کرتے ہیں "حضرت علامہ کو دکھ اس بات کا ہے کہ مولانا حسین احمد کو اپنی غلطی پر اصرار ہے اور اب انہوں نے اپنے اس ارشاد کے علاوہ کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے وہ یہ کہ اسلام میں قوم اور ملّت دو الگ الگ وجود ہیں حضرت علامہ نے فرمایا اب تو مضمون لکھنا ضروری ہو گیا ہے" ع۲۴

حضرت علامہ نے مزید فرمایا "یہ سیاست کا چکر بھی عجیب ہے۔ انگریزوں کی ضد میں کس طرح تلبیس حق بالباطل سے کام لیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ مسلمان کیوں نہیں سمجھتے اسلام کی اجتماعی روح کیا ہے وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے جو دین کے رمز شناس تھے۔ کیسے کیسے الفاظ ہیں جو لوگوں کی زبان سے نکل رہے ہیں قوم۔ متحدہ قومیّت۔ وطن وطنیّت۔ آزادی۔ خود اختیاری لیکن کوئی نہیں سمجھتا۔ آج کل کی سیاست میں ان کے کیا معنی ہیں۔ الفاظ کے معنوں کا متعیّن

ع۲۳ متحدہ قومیّت اور اسلام مرتبہ مولانا حسین احمد مطبوعہ مکتبہ محمودیہ لاہور ص ۸ تا ۹

ع۲۴ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۱۰

ہو جانا ضروری ہے۔ ان کا تجزیہ بھی ہو جانا چاہیئے۔ یہ الفاظ عام ہو رہے ہیں ضرورت ہے ان کو سمجھنے کی لیکن مسلمانوں کو احساس ہی نہیں۔ انہیں کس قسم کی جدّ و جہد درپیش ہے۔ از روئے سیاست ہی نہیں اخلاقاً اور ذہناً بھی۔ کاش مسلمان کوئی سیاسی فکر پیدا کریں"۔ ع۲۵

ان دنوں حضرت علامہ مسلمانوں کی عموماً اور علماء کانگرس کی غیر اسلامی روش سے خصوصاً دلی رنج اور ذہنی تکلیف تھی وہ ہمہ وقت اضطرابی کیفیت میں رہتے۔ سیّد نذیر نیازی صاحب نے اُن کی اس کیفیت کو اُن کے ایک مخلص اور جان نثار عقیدت مند کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے "حضرت علامہ سوتے سوتے اکثر اُٹھ بیٹھتے ہیں کہتے ہیں مسلمانوں کو کیا ہو گیا جو لوگ دین کے رازدار تھے وہ دین سے بے خبر ہیں وہ بھی کہنے لگے ہیں قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ ع۲۶

چوں کہ ان دنوں متحدہ قومیّت اور اسلامی قومیّت ہی کا مسئلہ تھا جس پر اکثر حضرت علامہ اور اُن کے قریبی دوستوں اور ہم جلیسوں میں گفتگو رہتی۔ آپ نے متحدہ قومیّت کے تصوّر پر بحث کرتے ہوئے فرمایا "یہ تصوّر سر تا سر کفر ہے مگر افسوس ہے مولانا ہر روز ایک نئی بحث چھیڑ دیتے ہیں اب وہ لغت کا سہارا لے رہے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں قوم اور ملّت میں فرق کریں حالاں کہ یہ مسئلہ لغت کا نہیں قرآن پاک کی تعلیمات کا ہے"۔ ع۲۷

مزید فرمایا "مولانا کو چاہیئے لغت کا سہارا نہ ڈھونڈیں انہیں چاہیئے اس

ع۲۵ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۱۰

ع۲۶ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۱۷

ع۲۷ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۲۰

امر پر نظر رکھیں کہ قرآنِ پاک نے اگر کسی لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تو کن معنوں میں یہ نہیں کہ خود اپنی طرف سے اس کا معنیٰ و مفہوم متعین کرنے کی کوشش کریں۔ مولانا اور ان کے حامیوں کا یہ خیال بہر صورت غلط ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ وطن بھی قومیت کی کوئی مستقل اساس نہیں ہے" ع۲۸

جدید تعلیم اور افرنگ زدہ طبقہ سے حضرت علامہ کو بہتری کی بہت کم امیدیں تھیں ان کی احیاء اسلام کی امنگیں اور آرزوئیں تو سراسر علماء اسلام ہی سے وابستہ تھیں۔ لیکن وہ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ افرنگ زدہ طبقہ تو کسی حد تک اسلام کے قریب آرہا ہے لیکن گاندھویت کے مارے ہوئے علماء اسلام سے بہت دور جارہے ہیں اپنی اس اضطراب اور ذہنی خلش کو حضرت علامہ نے یوں بیان کیا ہے۔ "یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوٹ اور پتلون کے مقابلے میں جسے گویا دہریت کی علامت سمجھا جاتا تھا اب سیاست اور تمدن کے وہ افرنگی تصورات جو اسلام کی ضد ہیں جبہ اور دستار میں پناہ لے رہے ہیں" ع۲۹

مزید ارشاد فرماتے ہیں "مسلمانوں میں ایک افرنگ زدہ طبقہ پیدا ہو گیا تھا بظاہر اب یہی طبقہ اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے" ع۳۰

یہ ہے حضرت علامہ کے اس دور کی ذہنی کیفیت اور دینی اضطراب کا اجمالی خاکہ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ سید نذیر نیازی صاحب کی کتاب "اقبال کے حضور" کا ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ فرمائیں۔ میں پہلے واضح کر

ع۲۸ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۲۰/۲۲۱

ع۲۹ ایضاً " " " ص ۲۴۷

ع۳۰ " " " " ص ۲۴۷

چکا ہوں کہ حضرت علامہ متحدہ قومیّت کے موضوع پر ایک مفصّل مقالہ لکھنا چاہتے تھے اور اب تو مولوی صاحب کے مذکورہ بیان کے بعد اس کا لکھا جانا از حد ضروری ہو گیا تھا۔ اس کا ذکر سیّد نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور" میں اس طرح کیا ہے "فرمایا۔ کیا مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔

میں نے عرض کیا۔ ضرور اور آپ ہی کی طرف سے۔ فرمایا! کیوں میں نے کہا" اس لیے کہ کانگرسی خیال علماء الحاد اور لادینی کی جس دعوت کو دانستہ یا نادانستہ تقویت پہنچا رہے ہیں وہ روز بروز ترقی پر ہے۔ میں ان کے نظریات سے خوب واقف ہوں۔ پڑھا لکھا طبقہ تو خیر قرآن و حدیث سے دور ہٹ چکا ہے اور سمجھتا ہے وطنی قومیّت سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ رہے عوام سو ان میں کانگرسی علماء کے زیر اثر اب یہ تحریک پھیل رہی ہے کہ وطنی قومیّت کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ غیر کانگرسی علماء میں کون ہے جو انہیں سمجھائے کہ جن سیاسی اور اجتماعی حقائق کے پیشِ نظر یہ تحریک پھیلائی جا رہی ہے۔ اس کی صحیح نوعیت کیا ہے اور بطور ایک نظامِ مدنیّت اسلام کی تعلیمات کیا۔ اگر آپ بھی خاموش رہے تو ان مغالطوں کا ازالہ کیسے ہوگا جو اس باب میں پیدا ہو چکے ہیں۔ کانگرسی خیال اخبارات کو دیکھ لیجیئے۔ مولانا حسین احمد کی حمایت میں کس طرح مضمون پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے اخبار خاموش ہیں۔ آپ کا یہ مضمون شائع ہو گیا تو مجھے یقین ہے ویسا ہی مؤثر ثابت ہوگا جیسے "اسلام اور احمدیت"۔ ع۱۳

سیّد نذیر نیازی صاحب ہی کی نہیں بلکہ حضرت علامہ کے دوسرے دوستوں مثلاً چوہدری محمد حسین اور میاں محمد شفیع صاحب (م۔ش) کی بھی یہی رائے تھی کہ حضرت علامہ

ع۱۳ اقبال کے حضور مرتبہ سیّد نذیر نیازی ص ۲۳۱

بنفسِ نفیس مولوی صاحب کے بیان کا جواب لکھیں۔ چنانچہ ان دوستوں کے اصرار اور "دینِ مصطفٰی" کے تحفظ کے جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضرت علامہ نے ادھر توجہ دی اور ایک مضمون "جغرافیائی حدود اور مسلمان" لکھا جو اخبار "احسان" لاہور کے ۹ رمارچ ۱۹۳۸ء[۳۲] کے پرچے میں شائع ہوا۔ اس مضمون نے نسلی اور جغرافیائی قومیّت کے حامیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور ان کے ریت کے بنائے ہوئے محل مسمار ہو گئے۔ اس مضمون کی مقبولیّت کا یہ عالم تھا کہ "احسان" کے علاوہ دو قومی نظریہ کے دوسرے حامی اخبارات و رسائل میں بھی نقل ہوا۔

اس مضمون کے شائع ہونے کے چند ہی ماہ بعد بمبئی سے بابائے قوم کی سوانح عمری بعنوان "محمد علی جناح" شائع ہوئی تو اس مضمون کو اس کی اہمیّت کے پیشِ نظر مرتب کتاب جناب عبدالعزیز صاحب نے پورے کا پورا کتاب میں نقل کر دیا۔ یہ مضمون آج بھی ۴۰ سال گذر جانے کے باوجود اتنا ہی ضروری اور ایمان افروز ہے جتنا کہ اس زمانے میں تھا۔ اب ہم ذیل میں اس جامع۔ بلیغ اور بصیرت افروز مضمون کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوگا کہ اس مردِ حق آگاہ اور حکیمِ اُمت ...... نے اس مضمون میں کانگرسی ذہن کے عالم مولوی حسین احمد صاحب کے پا در ہوا نظریات۔ خیالات اور اعتراضات کا کس جامعیت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) "میں نے اپنے مصرع، سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است" میں لفظ "ملّت" قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں "شرع" اور "دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی۔

---

[۳۲] اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں ص ۵۹۵

فارسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملّت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملّت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ لفظِ ملّت کے معنی زیرِ بحث مسائل پر چنداں مؤثر نہیں اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ زمانۂ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں ایسے مشورہ سے قومیّت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے جس کی تنقید ایک مسلمان کے لیے ازبس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ میرے اعتراض سے مولانا کو یہ شبہ ہوا کہ مجھے کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ مقصود ہے حاشا و کلّا میں نظریۂ وطنیّت کی تردید اُس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا (ہم اس کتاب کے باب اوّل میں ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ ۱۹۰۸ء سے لے کر تاریخ وفات تک نظریۂ وطنیّت کے زبردست مخالف رہے ہیں۔ سیّد نور محمد قادری) مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیّت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں زمانہ کا اُلٹ پھیر بھی عجیب ہے ایک وقت تھا کہ نیم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان "تفرنج" میں گرفتار تھے۔ اب علماء اس

لعنت میں گرفتار ہیں۔ شاید یورپ کے جدید نظریے ان کے لیے جاذبِ نظر ہیں مگر افسوس ہے

گرز فرنگ آیدش لات و منات ۔۔۔ تو نہ گردو کعبہ را رختِ حیات[۲۳]

(ب) سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم

"میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی اور ایرانی وغیرہ "وطن"، جو لفظ اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا اس کے حدود آج کچھ اور ہیں اور کل کچھ اور۔ کل تک اہلِ برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے۔ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چوں کہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لیے جب لفظِ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور

---

[۲۳] "محمد علی جناح" مرتبہ عبد العزیز بی۔ ایس۔ سی مطبوعہ بمبئی ص ۴۴ تا ۴۶

پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔'' ع۳۴

(ج) مولانا حسین احمد کا نظریۂ وطنیت

''مگر جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اس لیے میں اُمید کرتا ہوں کہ قارئین مندرجہ سطور کو غور سے پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ مولانا حسین احمد عالمِ دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، امتِ محمدیہ کے لیے اُس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظِ قوم استعمال کیا ہے یا لفظِ ملت ہر اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا جو اُن کے تصوّر میں اُمّتِ محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوس ناک امر ہے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا ہے لیکن احساس ان کو غلطی کے اعتراف یا اس کی تلافی کی طرف نہیں لے گیا۔ انہوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لے کر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے ملت اور قوم کے لغوی فرق اور امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ ملت کو قوم سے ممتاز قرار دینا ان لوگوں کی تشفی کا باعث تو ہو سکتا ہے جو دینِ اسلام کے حقائق سے ناواقف ہیں واقف کار لوگوں کو یہ قول دھوکا نہیں دے سکتا۔'' ع۳۵

(د) مولانا کی زمین و آسمان

''مولانا نے بظاہر یہ کہہ کر کہ ''میں نے لفظِ ملت اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیا میں ملت کو وطنی قوم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔''

ع۳۴ ''محمد علی جناح'' مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس سی مطبوعہ بمبئی ص ۴۶/۴۷

ع۳۵ ''محمد علی جناح'' مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس سی مطبوعہ بمبئی ص [illegible]

گویا اگر قوم زمین ہے تو ملّت بمنزلہ آسمان ہے لیکن معناً اور عملاً آپ نے ملّت کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں چھوڑی اور آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ وعظ فرما دیا ہے کہ ملک و سیاست کے اعتبار سے اکثریت میں جذب ہو جاؤ قوم قومیّت کو آسمان بناؤ دینِ فطرت زمین بنتا ہے تو بننے دو۔ مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملّت کے معنی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا۔ مجھے زبانِ عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے یہ طعنہ سر اور آنکھوں پر لیکن کیا اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامتہ المسلمین کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآنِ حکیم کی طرف مولانا رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی استشہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالمِ دین نہیں نہ عربی زبان کا ادیب ہے

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا" [ع۳۶]

(۵) "عہدِ حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبی امیّ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں۔ نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی موحّد و مشرک۔ اس وقت سے لے کر دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں تیسری کوئی ملّت نہیں۔ کعبتہ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہو گئے۔ قوم اور قومیّت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملّت کے

ع۳۶ "محمد علی جناح" مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس سی مطبوعہ بمبئی ص ۵۲-۵۱

بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں (باپ بیٹا قادری) نے کی "و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل۔ ربنا تقبل منا۔ انک انت السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک" کیا خدا کی بارگاہ سے اُمتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی حصہ عربی۔ ایرانی۔ افغانی۔ مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ "الکفر ملۃ واحدۃ" کی ہے۔ اُمتِ مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کرے بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی۔ تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دینِ اسلام سے ہی تقویم پاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامقبول و مردود ہے۔ ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لیے قابلِ غور ہے کہ اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے یہ پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دل جوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکہ کا بھی تھا مگر افسوس آپ (یعنی مولانا حسین احمد صاحب) اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے

نزدیک اسلام، دینِ قیّم، اُمّتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان کو چھوڑ دیا۔ ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابو جہل اور ابولہب اُمّت مسلمہ ہی کو آزادی سے پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آئی محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی لیکن جب محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی جو لوگ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب اُمّتِ محمّدیہ بن گئے پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے اب ملک و نسب اُن کا گرفتار ہو گیا ۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسخہ را	نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمد	ندادے دعوتِ دیں بولہب را[۲۷]

(و) قادیانی افکار کا تتبع

در حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا اُن کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیّت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی انکار میں افکار خاتمیّت کا۔ نظریۂ وطنیّت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوّت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوّتِ محمّدیہ کے اکمل ہونے سے انکار ہے بعینہٖ اسی طرح وطنیّت کا نظریہ بھی اُمّتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا

---

[۲۷] "محمد علی جناح" مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس۔ سی مطبوعہ بمبئی ص ۵۶ تا ۵۸

ہے۔ بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی "انکارِ خاتمیت" الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے جس کی توضیح صرف اسی وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمان اور بالخصوص ان کے بظاہر متعدد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا" ع۳۸

(س) "نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ان کو تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے۔ جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیّل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ "تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو مگر اس نسلی ع اور وطنی ع اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے

ع ذیل میں ایک خود گم کردہ رہبر کی تحریر ملاحظہ فرمائیں جس میں ایک تو نسلی قومیت کا نعرہ لگایا گیا ہے اور دوسرے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ اسلام کو جدید سانچے میں ڈھال کر کانگریس کا جزو بنا دیا جائے تاکہ سب لوگوں مسلمانوں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکے۔ اس ایمان سوز اور باطل افروز تحریر کے لکھنے والے مولوی عبیداللہ

ع۳۹ محمد علی جناح مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس۔ سی مطبوعہ بمبئی ص ۶۱

درمیان موجود ہے۔ ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی۔" ع۳۹

سندھی ہیں جنہیں کچھ لوگ تو اپنی اندھی عقیدت کی وجہ سے اور کچھ نافہمی کی وجہ سے محسن اسلام سمجھتے ہیں سندھی صاحب کی یہ تحریر اُن کے ایک مفصل خط کا اقتباس ہے جو انہوں نے ۱۳۵۶ھ بمطابق ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر چوتھ رام کو لکھا تھا ملاحظہ ہو:

"میرا یہ فیصلہ قطعی ہو گیا ہے کہ مجھے اسلام کی حفاظت کے لیے ہندی مسلمانوں کے اسلام کو نیشنل کانگرس کا جزو بنا دینا چاہیئے (کسی نے سچ کہا ہے:
ع اندھے کو اندھیرے میں دور کی سوجھی۔ سیّد نور محمد قادری) میری تحقیق میں ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت خصوصاً ادنیٰ طبقہ کے لوگ میری طرح ہندوؤں کی اولاد ہیں ان کا قدرتی وطن اور ملک ہند کے سوا اور ملک نہیں ہو سکتا اور جو بزرگ باہر سے آئے اور یہیں کے ہو رہے وہ بھی ہماری طرح ہند سے باہر کوئی بھی ہمدرد نہ پائیں گے۔ میں نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی رہنمائی میں اسلامی تعلیمات پر نظر ثانی شروع کی۔ اس کو ایسا کر دیا کہ ہندوستانی قومیّت کے ساتھ جمع ہو سکے تاکہ تمام ہندوستانی قوموں سے مسلمانوں کی مذہبی جنگ ختم ہو جائے۔ میں نے اپنی قوم (یعنی مسلمان قوم) کی سائیکالوجی جانتے ہوئے اس نظریے پر اعتماد کیا ہے کہ جب ہم ہندوؤں پر ظلم کرنا چھوڑ دیں گے تو وہ کبھی ہم پر ظلم نہیں کریں گے (اللہ اکبر مسلمان ظالم اور ہندو مظلوم

ع۳۹ محمد علی جناح مرتبہ عبدالعزیز بی۔ ایس۔ سی مطبوعہ بمبئی ص ۵۸

حضرت علامہ کے اس مضمون کے زیادہ اقتباسات پیش کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ اس مضمون میں انہوں نے رائج الوقت سیاسی اصطلاحوں مثلاً قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی اور خود اختیاری پر اسلامی تعلیمات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) اور یہ الفاظ ایک مسلمان نام نہاد عالم کے قلم سے سید نور محمد قادری) آج بھی مسلمانوں کے بعض بڑے لوگ ہندوؤں کے سیاسی غلبہ سے ڈر رہے ہیں۔ میرا جواب ان کے لیے یہ ہے کہ شاید وہ پہلے ہندوؤں پر ظلم کر چکے ہیں" (رسالہ نقوش لاہور نمبر ۱۰۹ مکاتیب نمبر حصہ اوّل ص ۳۱۲) اوائل مارچ ۱۹۷۷ء میں محترمی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری دام ظلہ کے مطب میں "فیض الاسلام" راولپنڈی کے مدیر اعلیٰ علامہ عرشی امرتسری سے ملاقات ہوئی تو جب میں نے انہیں مذکورہ بالا اقتباس پڑھ کر سنایا تو وہ چکرا کر رہ گئے اور کچھ دیر کے بعد بے ساختہ کہنے لگے "یہ الفاظ اور مولانا سندھی کے قلم سے" انہوں نے اس تحریر کو فیض الاسلام میں درج کرنے کے لیے مجھ سے حاصل کر لیا اور اسے مئی ۱۹۷۷ء کے پرچہ میں شائع بھی کر دیا اور اس پر اپنے قلم سے ایک نوٹ بھی لکھا جو درج ذیل ہے "یہ تاریخی سند مولانا ایک ہندو (ڈاکٹر چوتھ رام) کے ہاتھ میں دے رہے ہیں کہ کسی ضرورت کے موقع پر گاندھی کے پجاری اور اسلام کے دشمن ہندو مسلمانوں کے منہ پر سخت تھپیڑ کی طرح استعمال کریں۔ اسلام لانے کے باوجود اسلام کو ہندو کانگریس میں ضم یا جذب کر دینا چاہیئے توبہ۔ توبہ عرشی" سید نور محمد قادری

۲ ذیل میں ایک اور شخصیت جو عام طور پر مؤرخ پاکستان۔ شارح اقبال اور شارح غالب کے نام سے مشہور ہے کے ایک مضمون "پاکستان کے چند بنیادی مسائل" سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس میں مصنّف نے دعویٰ کیا ہے

کی روشنی میں بھرپور نظر ڈالی ہے اور پھر اس مضمون کے مندرجات آئندہ کے لیے مسلمان قوم کا دستور العمل بنے ۔ قارئین کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ حضرت علامہ کے پورے مضمون کا دقیق نظروں سے مطالعہ کریں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ کانگرسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷) کہ پاکستان دو قومی نظریہ کی بنا پر نہیں بلکہ جغرافیائی مجبوریوں کی بنا پر وجود میں آیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس شخصیت کو محبِ پاکستان سمجھا جاتا رہا ہے اور سمجھا جاتا ہے ۔ مضمون پاکستان بننے کے گیارہ سال بعد "امروز" کے خاص نمبر میں شائع ہوا ہے اور لکھنے والی شخصیت مولانا غلام رسول مہر کے نام سے شہرت رکھتی ہے ۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھ لینی چاہیئے کہ تقسیم کے جو خط شمال مغرب اور شمال مشرق میں کھینچے گئے تھے وہ جغرافیائی خط تھے یعنی دونوں جانب زمین کے معین ٹکڑوں کو الگ الگ کیا گیا تھا ۔ مسلموں اور غیر مسلموں کے گروہوں کو الگ الگ نہ کیا گیا تھا پھر دونوں قوموں کا نظریہ کہاں سے پیدا ہوا یا اس سے وہ مفہوم پیدا کرنے کی کیا دلیل ہے جسے دو قوموں کے نظریے کے سلسلے میں پیشِ نظر رکھا جاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کی بنیاد قومی نہیں جغرافیائی تھی ۔" (پاکستان کے چند بنیادی مسائل از غلام رسول مہر روزنامہ امروز "دس سالہ نمبر" ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۴۴)

اس اقتباس کے بنظرِ غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے میں ان نام نہاد مؤرخینِ پاکستان کا کتنا حصہ ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ہر حکومت ان کی سرپرستی بھی کرتی رہی ہے ۔ سید نور محمد قادری

علماء کے پھیلائے ہوئے غلط نظریات کا اثر زائل کرنے کے لیے یہ مضمون کس قدر

مفید اور کار گر ثابت ہوا۔

(۸) حضرت علامہ کے مذکورہ مضمون کے جواب میں مولوی صاحب نے ایک مفصل کتابچہ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" لکھا جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کتابچہ کا جواب متعدد اہلِ علم نے تحریر کیا۔

مولانا عبد الرشید نسیم طالوت کے فہمائشی خط کے جواب میں مولوی صاحب نے جو طویل خط لکھا اس میں بجائے اعترافِ حقیقت کے غلط تاویلوں سے کام لے کر کئی نئے مسائل چھیڑ دیئے یہ خط مولوی صاحب نے ۸ ر ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۹ ر فروری ۱۹۳۸ء کو لکھا اور ساتھ ہی اپنے مسلک کے مختلف اخبارات و رسائل کو شائع کرنے کے لیے جاری کر دیا جس کی اطلاع طالوت صاحب کو نہ دی۔

یہ خط جب طالوت صاحب کو ملا تو انہوں نے اس خط سے چند مفید اور بے ضرر اقتباسات نقل کر کے حضرت علامہ کو خط کی شکل میں بھیجے (ان اقتباسات کو یہاں نقل کرنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں ہم پچھلے صفحات میں مولوی صاحب کے اس خط یا بیان کے ضروری اقتباسات نقل کر چکے ہیں قادری) اور ساتھ ہی لکھا "یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباس ہیں جو میرے نزدیک ضروری تھے (واقعی طالوت صاحب نے وہی اقتباسات اس خط میں درج کئے جو اُن کے نزدیک ضروری تھے اگر پورے خط کی نقل حضرت علامہ کو ارسال فرماتے تو معاملہ الٹ ہو جاتا۔ قادری) کہ آپ کی نظر سے گذر جائیں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا کی پوزیشن صاف ہے اور آپ کی نظم کا اساس غلط پروپیگنڈے پر ہے آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بنا پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمایئے بصورتِ دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمایئے تاکہ مولانا سے مزید تشفی کر لی جائے ہمارے جیسے نیازمند جو دونوں حضرات کے عقیدت کیش ہیں دوگونہ رنج و عذاب میں

مبتلا ہیں (یہ بات تو طالوت صاحب نے رواداری کے طور پر کہہ دی ہے وہ عقیدت کیش تو صرف مولانا حسین احمد ہی کے تھے اور اُن ہی کی طرح جغرافیائی قومیت کے حامی جیسے کہ ہم پچھلے صفحات میں "اقبال کے حضور" سے ایک اقتباس میں ثابت کر چکے ہیں (طالوت صاحب اگر رنج و عذاب میں مبتلا تھے تو محض اس وجہ سے کہ اُن کے ہیرو کی پوزیشن خراب ہو چکی تھی - قادری) اُمید کہ باوجود عدیم الفرصتی کے ہمیں اس ورطۂ حیرانی سے نکالنے میں آیۂ رحمت ثابت ہوں گے" طالوت (نوٹ میرے پیشِ نظر نسخہ مطبوعہ لاہور میں اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں) [ع۴۰]

طالوت صاحب کے اس خط کے جواب میں حضرت علامہ نے طالوت صاحب کو ۱۶ر فروری ۱۹۳۸ء کو خط لکھا جو حسبِ ذیل ہے۔

"جنابِ من - مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے ان میں سے بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے - مگر بعض نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج کئے ہیں - اس واسطے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کے لیے انتخاب کیا ہے جواب انشاء اللہ اخبار "احسان" میں شائع ہوگا - میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں " "فقط مخلص محمد اقبال" [ع۴۱]

مندرجہ بالا خط لکھنے کے بعد حضرت علامہ نے تھوڑے ہی وقفہ کے بعد طالوت صاحب کو ایک اور خط اس امید میں لکھا کہ شاید مولوی صاحب راہِ راست پر آجائیں کیونکہ مولوی صاحب سے لڑائی (باستثنا چند) پورے دیوبند سے لڑائی

ع۴۰ متحدہ قومیت اور اسلام از مولوی حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۱۵-۱۴

ع۴۱ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۱۶

تھی اور پھر حضرت علامہ کو مولوی صاحب سے کوئی ذاتی رنجش یا پرخاش نہیں تھی صرف نظریاتی طور پر اختلاف تھا۔ ہاں اختلاف اتنا شدید کہ کفر اور اسلام کی جنگ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جیسا کہ ہم پیچھے "اقبال کے حضور" سے ایک اقتباس میں ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ متحدہ قومیّت کے نظریہ کو سرتا سر کفر سمجھتے تھے۔ خیر اب حضرت علامہ کا یہ دوسرا خط بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"جناب من۔ سلام مسنون۔ میں حسب وعدہ آپ کے خط کا جواب "احسان" میں لکھوانے کو تھا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کو گوش گزار کر دینا ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھنے کی زحمت گوارا فرما کر اس بات کو صاف کر دیں گے۔ جو اقتباسات آپ نے اُن کے خط سے درج کئے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مگر اُن کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کیوں کہ فرنگی سیاست کا نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر اُن کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے۔ اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کے مقصود ان الفاظ سے کیا تھا۔ ان کا جو جواب آئے وہ آپ مجھے روانہ کر دیجئے۔ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلایئے کہ میں اُن کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔ البتہ اگر مذکورہ بالا ان کا مقصد وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے تو میں اُن کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا مشورہ

مولوی صاحب کے شایانِ شان نہیں اور مسلمانانِ ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے تو انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف اسلامی قومیت اور ملّت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گذارا ہے محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسوس ہوتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا نہ آج مقصود ہے بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردہ بناتا رہے میرے نزدیک لعنتی ہے مخلص محمد اقبال" ع۴۲

نوٹ میرے پیشِ نظر "متحدہ قومیت اور اسلام" مطبوعہ لاہور کے نسخہ میں اس خط پر ۱۰ر فروری کی تاریخ درج ہے جو غالباً سہو کاتب ہے یہ خط ۱۶ر فروری والے خط سے بعد کا ہے اور شاید ۲۰ر فروری کو لکھا گیا ہو۔ قادری

حضرت علامہ کے اس خط کے موصول ہونے کے بعد طالوت صاحب نے مولوی صاحب کو جو خط لکھا اور مولوی صاحب نے اُس خط کا جو جواب دیا وہ "متحدہ قومیت اور اسلام" مطبوعہ لاہور کے ص ۱۹ تا ۲۲ پر چھپا ہوا ہے۔ اس خط میں احساسِ ندامت اور اعترافِ حقیقت تو کسی حد تک اوپرے دل سے کیا گیا ہے لیکن خط کے آخر میں مسلم لیگ اور حضرت علامہ کے خلاف دل کی بھڑاس خوب نکالی ہے۔ ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے "کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو ایک قرار دیا گیا میں فرق نقل کر چکا ہوں۔ اگر خلافِ لغت سر صاحب موصوف (حضرت علامہ کے لیے مولوی صاحب نے ہر جگہ سر کا لفظ طنزاً استعمال کیا ہے) کا نظریہ

ع۴۲ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۱۷/۱۸

دونوں کے اتحاد وغیرہ کا ہے تو اُن کو اپنے نظریے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق تھا بہر حال ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب میں علیحدہ ہوا ہوں[عـ] ہر قسم کے سبّ وشتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوں۔ وہ کون سے الفاظ و معاملات ہیں جو نہیں کیے گئے۔ سر صاحب موصوف تو جب بھی غیر ہیں۔ یہاں اپنے کیا کمی کر رہے ہیں والسّلام دعوتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ ننگِ اسلاف حسین احمد،، [عـ۴۳]

اپنے اس خط میں مولوی صاحب نے لکھا ہے ”میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیّتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیّت کی خبر ہے یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے خبر ہے انشا نہیں ہے کسی ناقل نے مشورہ کا ذکر بھی نہیں کیا نہ امر اور نہ انشا کا لفظ ذکر کیا ہے پھر اس مشورت کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔“ [عـ۴۴]

جب اس خط کی نقل طالوت صاحب کی معرفت علامہ کو پہنچی تو انہوں نے سمجھا کہ شاید مولوی صاحب راہِ راست پر آ رہے ہیں تو انہوں نے اپنا رجوعی

عـ مولوی حسین احمد صاحب مسلم لیگ سے کیوں اور کیسے علیحدہ ہوئے اس پر بحث ہم مقالہ کے آخر میں کریں گے۔

عـ۴۳ متحدہ قومیّت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۱/۲۲

عـ۴۴ ایضاً 〃 〃 ص ۲۰

بیان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے "احسان" کے پرچے میں شائع کرایا لیکن علامہ کی مومنانہ بصیرت دیکھیے کہ اپنے اس بیان کو بھی اس شرط کے ساتھ مشروط رکھا کہ "مولوی صاحب نے اپنے ارشاد "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" کا ذکر محض برسبیل تذکرہ کیا ہو لیکن اگر انہوں نے مسلمانوں کو اس نظریہ کے اپنانے کا مشورہ دیا ہو تو مجھے اس پر اعتراض ہے۔" اب حضرت علامہ کے رجوعی بیان کا مکمل متن ملاحظہ فرمائیں۔

"جناب ایڈیٹر صاحب "احسان" لاہور السلام علیکم! میں نے جو تبصرہ مولانا حسین صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے اس میں اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد کہ "زمانہ حال میں اقوام اوطان سے بنتی ہیں" محض برسبیل تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور اگر مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریۂ وطنیت اختیار کریں تو دینی پہلو سے اِس پر مجھ کو اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار "انصاری" میں شائع ہوا مندرجہ ذیل الفاظ ہیں۔

"لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور اُن کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانانِ ہندوستان کو مشورہ دیا ہے۔ اس بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار "احسان" میں شائع ہوا ہے۔ لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا۔ جس کی ایک نقل انہوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اس خط میں مولانا ارشاد

فرماتے ہیں "میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیانِ واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں۔ اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلافِ دیانت ہے۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سباق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں،" یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریّت اور ذہنیّت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ خبر ہے انشاء نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا پھر اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے،" خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا حق اُن پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے اُن عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کے توضیح کے صلہ میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں[۵۳]۔ خدا تعالیٰ اُن کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیّت دینی (یعنی اعتراف قصور) کے احترام میں میں اُن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں محمد اقبال،"[۵۴]

یہ ہے حضرت علامہ کے مشروط بیان کا مکمل متن جسے مولوی صاحب کے کئی معتقدین "توبہ نامہ" اور "معافی نامہ" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بیان ۲۸/مارچ ۱۹۳۸ء کے "احسان" میں چھپا اور اگر اس تاریخ کے بعد مولوی صاحب کی طرف سے دوبارہ اس مسئلہ کو نہ چھیڑا جاتا اور وہ نئے اسلحہ سے لیس ہو کر جدید وطنیت

---

[۵۳] یہ ایک طنز ہے، جسے دیوبندی اپنی مدح سمجھ رہے ہیں۔

[۵۴] متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۴-۲۳

(متحدہ قومیّت) کے غلط اور باطل نظریہ کی حمایت و وکالت نہ کرنے لگ پڑتے تو حضرت علامہ کے اس بیان کو "توبہ نامہ" کہا جاتا یا "معافی نامہ" کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس بیان کے بعد مولوی صاحب کی طبیعت میں "متحدہ قومیت" کے نظریہ کی حمایت اور تبلیغ کے لیے ایک نیا ولولہ ابھرا اور انہوں نے ایک مضمون بعنوان "متحدہ قومیّت اور اسلام" لکھنا شروع کر دیا جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد چند ماہ بعد مجلس قاسم المعارف دیوبند سے شائع ہوا۔ مولوی صاحب نے اس مضمون کے صرف ۲/۳ ابتدائی صفحات ہی لکھے تھے کہ حضرت علامہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے جس کا ذکر مولوی صاحب کے مضمون میں بھی ہے۔ حضرت علامہ کی وفات کا مولوی صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر باطل کی حمایت میں زیادہ دلیر ہو گئے اور مضمون میں جہاں کہیں حضرت علامہ کا ذکر ناگزیر تھا وہاں انہوں نے اُن کا ذکر متانت اور تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ میں کیا۔ ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو۔ "یہ امر یقینی اور غیر قابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور اُن کے کمالات بھی غیر معمولی تھے وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ اور دیگر کمالاتِ علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب مگر باوجود کمالات گوناگوں ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں ‏ ‏ بغلط بر ہدف زند تیرے" ع۴۶

اپنے اس مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" میں مولوی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ نظریۂ متحدہ قومیت نہ صرف میرا مشورہ ہے بلکہ میں اسے ہندوستانی مسلمانوں

ع۴۶ متحدہ قومیّت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۳۰

کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ ثبوتِ دعویٰ کے لیے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) ڈاکٹر صاحب مرحوم کا آخری بیان جس میں مرحوم نے بحث کے ختم کر دینے کا اعلان فرمایا ہے۔ نظر سے گزرا۔ اس بیان سے اگرچہ دہلی کی تقریر کے متعلق ہیجان رفع ہو گیا مگر نفسِ مسئلہ اور اس کے لیے جدّ و جہد اور عملی جامہ پہنانے کی سعی کے متعلق جو کہ میرا نہ صرف مشورہ ہی ہے بلکہ میں موجودہ احوال و ادوار میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیجان اور بڑھ گیا (یعنی مولانا کے اعتراف یا احساسِ ندامت کے بعد متحدہ قومیت کے حامیوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت   پر شب کی منتوں نے کھو دی رہی سہی (قادری)

میں نے ۹ ذی الحجہ کے بیان میں اس کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ اگرچہ دہلی کی تقریر میں اس کی ترغیب بالکل نہ تھی۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے متعلق اپنی ناچیز رائے ملک کے سامنے پیش کر دوں اور اُن غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی قومیتِ متحدہ سے ممانعت اور اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہلِ ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جدوجہد عمل میں لا رہی ہے اور اس کی مقابل و مخالف قومیں اس کے غیر قابلِ قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوشش عمل میں لا رہی ہیں۔" [۴۷]

(ب) جس طرح جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔ دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا مقصود نہ تھا اور نہ کوئی لفظ

---

[۴۷] متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۸

اس کا ذکر کیا گیا تھا میں اس تقریر میں اُن نقصاناتِ عظیمہ کو بیان کر رہا تھا جو کہ انگریزی حکومت سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو پہنچے ہیں۔ ان ہی میں سے یہ امر بھی ہے کہ چوں کہ فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں اس لیے تمام باشندگانِ ہند اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں۔ بیرونِ ہند دیگر ممالک میں ہندوستانیوں کو شہری ہی نہیں بلکہ انسانی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے اور کسی قسم کا پروٹسٹ وغیرہ مؤثر نہیں ہوتا یہ صرف غلامی کا اثر ہے۔ برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمّل ہو سکتا تھا انہوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا بہر حال شاید اسی میں کچھ خیر ہو۔ اس حیثیت سے (یعنی ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بعد) یقیناً بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے مگر دوسری حیثیت سے کہ جناب ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانانِ ہند کو قومیتِ متحدہ کا مشورہ دینا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں یہ امر چوں کہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے اس لیے مجھ کو کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔" ع۴۸

(ج) "متحدہ قومیّت کا جذبہ جو کہ ان مذاہب مختلف ہندیہ میں بجز وطنیّت اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ جملہ اقوامِ ہندیہ دوش بدوش ہو کر جنگِ آزادی کریں اور اپنے لیے زندگی اور بہبودی کی صورتیں پیدا کریں۔ دین اور دنیا کا تحفظ ان کے لیے صرف برطانیہ سے آزادی ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ بغیر اس کے کوئی اور صورت ہرگز نہیں، متحدہ قومیّت سے غرض ہی اشتراکِ عمل ہے وہ مفہوم ہرگز نہیں جس کو ہمارے مخالف حضرات سمجھ رہے ہیں۔" ع۴۹

ع۴۸ متحدہ قومیّت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۲۰/۲۱

ع۴۹ ایضاً " " " ص ۷۶

(د) غرض کہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سر سید جیسے تجربہ کار عقل مند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت بلکہ پالیٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اسی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنوا دیا پھر اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔ برطانیہ کی ملوکانہ اغراض معلوم ہیں اس کے افراد کی عیارانہ چالیں معلوم ہیں اس کے پروپیگنڈے کی نیرنگیاں معلوم ہیں۔" ع۵۰

(ھ) مولوی صاحب کی اس لے کی تان بھی حضرت علامہ ہی کے ذکر پر ٹوٹی ہے کیونکہ شروع سے لے کر آخر تک ہدف وہی تو ہیں ملاحظہ ہو "ہم اس عرض کے بعد اپنی تجویز کو اُس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراوش کر کے ذکر فرمائی ہے۔ مقاصدِ اصلیہ کو ہم نے واضح کر دیا ہے وہ تقریر (یعنی حضرت علامہ کی) یونانی یا یورپی فلسفہ اور انھی کی زبان ہے جس کی طرف خود جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم توجہ کرنا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں۔ آخر میں ہم دعا کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنی مغفرت اور فضل سے نوازے اور اُن کے متوسلین اور ہم کو اور تمام مسلمانوں کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے اور گمراہی وضلالت سے محفوظ رکھے۔" ع۵۱

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب ہندوستانی مسلمانوں جدید وطنیت کا نظریہ نہ صرف اپنانے کا مشورہ دے

ع۵۰ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۹۰

ع۵۱ متحدہ قومیت " " " ص ۹۲

رہے ہیں بلکہ اسے مسلمانوں کی جملہ تکالیف و مصائب کا واحد علاج بھی سمجھتے ہیں۔
اس مضمون کے چھپنے سے پہلے ہی حضرت علامہ تو مولائے کریم کو پیارے ہو چکے تھے
لیکن اُن کے نام لیواؤں اور اسلام کے پجاریوں میں ایسے کافی صاحب درد اور
فاضل لوگ موجود تھے جنہوں نے مولوی صاحب کے اس مضمون کی تردید میں زوردار
مضامین و مقالے اخبارات ورسائل میں لکھے جن میں سے کئی کتابی شکل میں علیحدہ
شائع بھی ہوئے۔ ایسے لوگوں میں مولانا رازی اور ابوالاعلیٰ مودودی خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔ رازی صاحب کا مقالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" چالیس
صفحات پر مشتمل ہے اور لاہور و دہلی سے کئی دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ مودودی صاحب
کے مقالہ کا عنوان بھی "متحدہ قومیت اور اسلام" ہی ہے اور مودودی صاحب کے
مجموعہ مضامین "مسئلہ قومیت" مطبوعہ لاہور طبع قدیم (غالباً ۱۹۳۹ء) کے انیس
صفحات ص ۴۵ تا ۶۴ پر پھیلا ہوا ہے۔

مولانا رازی اپنے مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں "جب ہم نے دیکھا کہ حضرت
علامہ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی
تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا جو اس وقت
ہمارے زیرِ نظر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا
صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں
افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ
نہیں ہے اس میں افہامِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہ کی تردید میں صرف
کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک
صفحہ سے اُبلتے نظر آ رہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریک کا محرک کونسا جذبہ
تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جب کہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ

فریقِ ثانی موجود ہی نہیں ہے جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے اور اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علامہ زندہ ہوتے تو ملّتِ اسلامیہ کے سامنے اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کون ہے لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے ؎

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کر چل دیا ساقی

وہ مے، وہ خُم، وہ صُراحی وہ جام باقی ہے

کہ خُم کدۂ اقبال میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ طلوعِ اسلام جسے پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآنِ کریم کی روشنی میں "متحدہ قومیت"، کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے"۔ ع ۵۲

اس کے بعد مختلف سرخیاں مثلاً "متحدہ قومیت کا مفہوم، اسلامی جماعت سے علیحدگی کفر ہے، عہد و پیماں کے تعلقات، غیر مسلموں سے موالات اور متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور وغیرہ قائم کر کے مولانا کے ہر نکتہ کا قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیا ہے۔

لیکن ہم رازی صاحب کے اس جامع مضمون کے مندرجات کی بجائے ذیل میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام"، کا خلاصہ قارئین کرام کے لیے پیش کر رہے ہیں اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ

ع ۵۲ "متحدہ قومیت اور اسلام"، مرتبہ مولانا رازی مطبوعہ لاہور ص ۳ - ۵

مولانا صاحب بھی بنیادی طور پر دیوبندی مکتبۂ فکر سے متعلق ہیں اور دوسرے ان سے بعض امور میں الگ نقطۂ نظر رکھنے کی بنا پر وہ ایک نئے فرقے کے بانی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ خلاصہ انہی کے الفاظ میں ہے "اس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب دار العلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے ایک نامور عالمِ دین اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنّف کا جو مرتبہ ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اس رسالہ میں "قومیّت کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہو گی اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا ہو گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔ ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیئے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنّف کا برتاؤ اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امرِ حق کا طالب ہو اور اس مسئلے کو جیسا کہ وہ فطرۃً اور حقیقتہً ہے۔ اس کے اصلی رنگ میں دیکھے اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویہائے نظر بھی ہیں مثلاً یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں اس لیئے صرف اسی نتیجہ کی طرف جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے اس لیئے آپ کو تلاش صرف ان ہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کے مخالف ہوں اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلافِ حق ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ مولانا نے اس رسالے میں کونسا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے اپنی

بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں۔

"ضروری معلوم ہوا کہ ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی قومیت متحدہ سے مخالفت اور اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہلِ ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے اور اس کی مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک خبر نہیں ہے یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۸۷ء یا اس سے پہلے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں لائی جاتی ہے۔" (ص ۵-۶) عہ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں "کہ ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی مگر باوجود کمالاتِ گوناگون ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔" مولانا مزید فرماتے ہیں۔

"افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور الغائے وطنیت و نسل و لسان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخبار و رسائل، لکچراروں کی بے حد و شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ پان اسلامزم ایک قصۂ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالکِ اسلامیہ یورپین اقوام کے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جبکہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم

عہ نوٹ۔ مولانا مودودی صاحب کے مضمون میں مولوی حسین احمد صاحب کی کتاب "متحدہ قومیت اور اسلام" کے صفحات کے جتنے بھی حوالے ہیں وہ سب مجلس قاسم العلوم دیوبند کے مطبوعہ نسخے کے ہیں۔ قادری

دیتا ہے وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیّت بنا سکتا ہے۔" (ص ۳۶-۳۷)

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہندوستانیوں کا وطن کی بنا پر متحدہ قومیّت بنا لینا انگلستان کیلئے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر "سیلے" کے مقالہ سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سا ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے۔ اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت بھی موجود نہ ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراکِ عمل شرمناک امر ہے۔ انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (ص ۳۸)

مندرجہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں نظر آ سکیں نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے انہیں زہر دکھائی دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کے بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی سے انہیں اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ برطانیہ پرست کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بین واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں

میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ کیا ٹیپو سلطان۔ جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، مصطفےٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان۔ اقبال۔ محمد علی، شوکت علی کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سُنا۔ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے۔ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں" لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم وطن سے بنی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں مثلاً امریکن خواہ حبشی ہو خواہ فرنگی باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو مثلاً مولانا حسین احمد صاحب بیرونِ ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنیلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی۔ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں۔ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیئے جیسے وہ شمار کئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا لغتِ عرب کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"، یا "مردوں اور

عورتوں کا مجموعہ" یا "ایک شخص کے اقربا" یا "دشمنوں کی جماعت" اس کا ثبوت انہوں نے آیاتِ قرآنی سے بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یا مسلمانوں کی "قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے یا وہ آیات جن میں لفظِ قوم پہلے یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغتِ عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ NATION اور NATIONALISM کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جس کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" میں بدیں الفاظ کی ہے۔

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو ان میں سے بڑے اور طاقت ور جاذبے تو دو ہیں ایک جاذبۂ نسل اور دوسرا جاذبۂ دین۔ لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک تخیلات اور افکار اور مشترک مقاصد و حوصلوں کا بھی اس احساسِ جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعہ افراد کو لبستہ اور پیوستہ رکھتے ہیں اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت

پھر بھی موجود ہوتی ہے۔" (ص ۱۱ "بین الاقوامی تعلقات")

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کو ایک جمعیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے۔ یا کوئی دنیا میں اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اسی معنی میں ایک قوم بنائے۔ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جا رہی ہے۔ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بار بار بدلتا ہے کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے "قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے۔"

آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا "وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین" (بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے) بس یہ فقرہ کہ یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغت عرب میں امت سے مراد ہر وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو۔ عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان عرب لکھتے ہیں۔

"وقولہ فی الحدیث ان — ترجمہ: حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ

یھود بنی عوف امتہ من المومنین یریدانھم بالصلح الذی وقع بینھم و بین المومنین کجماعۃ منھم کلمتھم و ایدیھم واحدۃ"

علیہ وسلّم کا یہ ارشاد کہ "ان یھود بنی عوف امتہ من المومنین" اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

اس لغوی "امت" کو آج کل کی اصطلاحی "قومیت" سے کیا واسطہ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی۔ البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اُس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرضِ بحث ہے۔ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ کیا وہاں کوئی مشترک مجلسِ قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں جس کی اکثریت ہو گی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اُسی کے منظور کئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے۔

مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آجکل کی "متحدہ قومیت" کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض "امتہ من المومنین" یا "امتہ

مع المومنین،، کے الفاظ معاہدہ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کل کانگرس بنا رہی ہے۔ ویسی ہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے تھے لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ۔

پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:

"ہم روزانہ مفادہائے مشترک کے لیے ہیئاتِ اجتماعیہ بناتے ہیں اس میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیے انتہائی جدوجہد کرتے ہیں میونسپل بورڈ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ کونسلات اسمبلیاں ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں جو کہ ان ہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ اس خاص مقصد کے ماتحت ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جدوجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام خلافِ دیانت۔ خلافِ تعلیماتِ اسلامیہ اور خلافِ عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔ (ص ۱۱م)

یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر مولانا اُسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ دونوں میں ایک ہی علت حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس اور مقیس بہ دونوں ناجائز ہیں تا وقتیکہ یہ علت اُن سے دور نہ ہو۔ علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقتِ نفس الامری کے

ادراک پر تو مبنی ہے نہیں۔ محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ اُن کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔

مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے نہ اُن کو یہ خبر ہے کہ اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں۔ اُن کے حدود اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت طرح اور کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدّن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مولانا با ایں ہمہ علم و فضل۔ کلچر، تہذیب پرسنل لاء وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے نا آشنا ہیں۔

مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انہوں نے تمام شرعی شرائط ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں اور ان کو وہ ایسی پُر احتیاط مُفتیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لا سکے لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہی ہے کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں کانگریس کی مراد بھی یہی ہے اور کانگریس بالکل نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوہ پر چل رہی ہے۔ مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالُف، یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ اس وفاق یا تحالُف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے تھا نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے کم از کم اب وہ اُمّت

پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس کر لیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی۔" عـ۵۳ (تلخیص)

یہ ہے مولانا مودودی صاحب کے جواب کا خلاصہ۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں وہ خود بھی لبِ کوثر سے پھسل گئے۔ ویسے جہاں تک دلائل اور جامعیّت کا تعلق ہے مولانا رازی کا پمفلٹ "متحدہ قومیّت اور اسلام" مودودی صاحب کے مضمون سے زیادہ جامع و مانع ہے۔ اگر اُس کے اقتباسات یا خلاصہ یہاں پیش کیا جائے تو مقالہ زیادہ طویل ہو جائے گا۔ جو اصحاب زیادہ تفصیل میں جانا چاہتے ہیں وہ رازی صاحب کا پمفلٹ "مکتبہ حبیبیہ" داتا بازار لاہور سے طلب کریں۔

(۱۱)

"مولوی حسین احمد صاحب کا آخری وقت تک "متحدہ قومیت" پر ایمان رہا"

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مولوی صاحب اپنی حیاتِ مستعار کے آخری لمحہ تک "متحدہ قومیّت" کے غیر اسلامی نظریہ کے مبلغ و مؤید رہے۔ مولوی صاحب نے اپنی خود نوشت "نقشِ حیات" میں اس مسئلہ پر زیادہ کھل کر بحث کی ہے۔ جب یہ کتاب تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص کارکن کی نظر سے گذری تو انہوں نے اس پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا جو ان کے مجموعہ مقالات "تاثرات و تصورات" میں شامل ہے۔ اس مقالہ کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین ہیں۔

(۱) "مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور اقبال جیسی عظیم المرتبت ہستیوں سے کتنا ہی اصولی اختلاف ہو ان کے کمالات اور صفات سے کوئی شخص آنکھیں

عـ۵۳: "مسلم قومیّت" مرتبہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ لاہور بار اوّل ص ۶۴ تا ۷۶ (خلاصہ)

بند نہیں کر سکتا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ حضرات دو مختلف مکاتب خیال کے نمائندے تھے۔ جب کہ اول الذکر دونوں متحدہ قومیت کے داعی۔ سیکولر حکومت کے حامی اور مسلم و غیر مسلم افراد کی مشترکہ حکومت اور متحدہ کلچر کے طرف دار تھے۔ حضرت اقبال "وطنیت" اور "متحدہ قومیت" کے دشمن اور خالص اسلامی اور قرآنی نظام حکومت کے مبلغ اور علمبردار تھے"۔[۵۴]

(ب) "مولانا حسین احمد مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں اپنی ایمانداری سے ایک اصول بیان کیا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اور مسلمانوں کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیاست کی بنیاد "متحدہ قومیت" کے نظریہ پر قائم کریں۔ حضرت اقبال نے اس نظریہ پر مخصوص انداز میں ایک ضرب رسید کی اور فارسی کے تین اشعار کا یہ مشہور قطعہ تصنیف کیا ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ اصولی اختلاف اس قسم کے لوگوں کے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے جو اپنے ہیروؤں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں یا جن کا اصول یہ رہتا ہے ؎

واعظ سے ادھر اک بات سنی ساقی سے ادھر اک جام لیا

ایسے لوگ جو نماز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے پڑھیں اور دستر خوان پر حضرت معاویہ کے ساتھ ہوں کبھی سکونِ قلب حاصل نہیں کر سکتے"۔[۵۵]

---

[۵۴] "تاثرات و تصورات" از عبد الوحید خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۶۷-۲۶۸

[۵۵] " " " " ص ۲۶۸-۲۶۹

(ج) ''ہم جیسے لوگ جو مولانا سے عقیدت رکھتے تھے یہی سمجھتے رہے کہ شاید مولانا نے جدید نظریہ ''وطنیت کے شر انگیز پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا وہ بیرونی طاقت کے مقابلے میں متحدہ محاذ کو ہی ''متحدہ قومیت'' کے لفظ سے موسوم کرتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت اقبال خدا کو پیارے ہو گئے مگر ''وطنیت اور ''قومیت'' کا اکھاڑا ویسے ہی قائم رہا۔ مولانا مودودی نے وطنیت اور قومیت سے متعلق خطرات کا ''ترجمان القرآن'' میں بڑی وضاحت سے ذکر فرمایا اور جمعیت الہند کا ترجمان ''الجمعیۃ'' اور ''انصاری'' ان کے جوابات دیتا رہا۔ ایک طرف وہی اقبال کا نظریہ ملت اور دوسری طرف وطنیت اور ہندوستانیت۔ علامہ اقبال کی تشریحات کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا اس کی ہم نوائی میں یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں حالانکہ مرحوم (یعنی علامہ اقبال) نے اپنے بیان میں اس امر کی صاف تردید کر دی تھی کہ ان کے نظریات کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اپنی عمر کے نصف حصہ سے زائد کو انھوں نے وطنیت کی مخالفت میں گزارا۔ لیکن مولانا مودودی نے اپنی تصریحات میں مسلم لیگ پر بھی اس طرح ضربیں لگائیں جس طرح جمعیۃ العلماء وغیرہ پر۔ کیوں کہ ان کے نزدیک نیشنلزم خواہ وہ وطنیت پر قائم ہو یا نسل پر، خواہ وہ ہندوستانی قومیت ہو یا مسلم قومیت ہر صورت میں ناقابلِ قبول ہے۔ مولانا حسین احمد اور ان کے حامی آخر وقت ان سے بھی لڑتے رہے اور طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہے۔'' ع۵۶

(د) ''صرف یہی نہیں بلکہ تقسیم ہند کے بعد مولانا نے دو جلدوں میں اپنی سوانح عمری

ع۵۶ ''تاثرات و تصورات'' از عبد الوحید خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۷ تا ۲۷

مرتب کی جو ان کی زندگی میں "نقشِ حیات" کے نام سے شائع ہوئی اس میں تو انہوں نے بالکل ہی کمال کر دیا ہے۔ معلوم نہیں اُن کے وہ عقیدت مند جن کا خیال ہے کہ مولانا نے "متحدہ قومیت" کا نظریہ سرے سے پیش ہی نہیں کیا بلکہ چند عاقبت فروشوں نے ان کی طرف ایک جملہ منسوب کر دیا تھا۔ "نقشِ حیات" میں ان کے نقوش و خطوط سے واقف ہیں یا کہ نہیں جو مولانا مرحوم نے اپنے تخیل کے مطابق اسلامی سیاست سے متعلق قائم کیے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس مقام (متحدہ قومیت) سے کئی منزل آگے نکل چکے ہیں جہاں حضرت اقبال نے اپنے فارسی قطعے میں ان کو ٹوکا تھا اور جس کے "ارمغانِ حجاز" میں شائع ہونے پر وہ چراغ پا ہیں۔ ہمیں کسی شخص کی دیانت رائے پر شک نہیں نہ کسی کی نیت پر حملہ کرنا مقصود ہے۔ بالخصوص جب کہ ہم جانتے ہیں کہ عشق اور نیاز مندی عاشق کی نگاہوں کی وسعت کو سمیٹ کر معشوق کی خوبیوں پر مرکوز کر دیتی ہے اور اس میں تنقید و تجزیے کی صلاحیت باقی نہیں چھوڑتی اس لیے ہم جہاں ان لوگوں (مولانا کے معتقدین) کو معذور اور ناقابلِ معافی سمجھتے ہیں وہیں اصل حقیقت کا انکشاف بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان کا اندازِ نگاہ اور زاویۂ نظر اگر ہو سکے تو توازن اور اعتدال کی طرف آسکے اور شاید وہ یہ سمجھ سکیں کہ بڑے سے بڑا عالم بھی نسیان اور خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر ہم ان بزرگوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ "نقشِ حیات" کی جلد دوم میں ظاہر کیے ہوئے مولانا کے افکار کو غور سے پڑھے بغیر شیخ الہند اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے دو متضاد نظریات سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش نہ کریں۔ اگر ان کو شیخ الہند کے اصولوں سے اتفاق ہے تو انہیں اس کا پورا اختیار ہے اور ہمیں اس پر اعتراض کا

کوئی حق نہیں اور وہ خوشی سے ان اصولوں کی تبلیغ کریں۔ خدا کے لیے دو اصولوں کو جو آپس میں متصادم ہیں ایک ثابت کرنے میں وقت ضائع نہ کریں اور عوام کے ذہنی انتشار کا موجب نہ بنیں"۔ ع۵۷

متحدہ قومیت کی وہ تعریف بھی ملاحظہ فرمائیں جو مولوی صاحب نے ۱۳۶۵ھ ۱۹۴۵ء کی ہے فرماتے ہیں "اگر عربی فارسی اردو اصطلاح اور عرف کو دیکھیں یا قرآنی شہادتوں کا لحاظ کریں تو اسباب قومیت صرف مذہب میں منحصر نہیں ہوتے کبھی متحدہ قومیت جغرافیائی حدود اور وطنیت سے ہوتی ہے تو کبھی نسل کی حیثیت سے کبھی پیشہ کی حیثیت سے اور کبھی رنگت وغیرہ وغیرہ سے"، ع۵۸

خان عبدالوحید خاں صاحب کے مضمون کے ان اقتباسات کے بعد ہم "متحدہ قومیت اور اسلام" کی بحث کو ختم کرتے ہیں اور اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ مولوی صاحب نے مسلم لیگ کو کیوں چھوڑا۔

(۱۲)

مولوی صاحب اور اُنکے ساتھیوں کا مسلم لیگ سے اخراج

مولوی صاحب اپنے خط بنام طالوت صاحب میں لکھتے ہیں "مسلم لیگ کی شرمناک کارروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب میں علیحدہ ہوا ہوں ہر قسم کے سب و شتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوں وہ کون سے الفاظ و معاملات ہیں جو نہیں کیے گئے"۔ ع۵۹

ع۵۷ "تاثرات و تصورات"، از عبدالوحید خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۷، ۲۸

ع۵۸ "پاکستان کیا ہے"، مرتبہ مولوی مدنی صاحب مطبوعہ دہلی ۱۳۶۵ھ ص ۱۱

ع۵۹ "متحدہ قومیت اور اسلام"، از مولانا مدنی مطبوعہ لاہور ص ۲۲

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے مولوی صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے مسلم لیگ میں شرکت چند مخصوص اغراض کو اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپائے ہوئے کی تھی۔ لیکن جب یہ اغراض پوری نہ ہوئیں اور اُن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تو انہوں نے مسلم لیگ کو خیرباد کہہ دیا۔ اُن کی خاص اغراض یہ تھیں۔

۱۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اور اُس کو اپنے ڈھب پر لا کر اُس کا کانگرس کے ساتھ الحاق کر دیا جائے۔

۲۔ مسلم لیگ سے حسبِ دل خواہ مالی فائدہ بھی اُٹھایا جائے۔

اب اس اجمال کی تفصیل سنیئے۔

مولوی صاحب کے ایک ساتھی مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں :۔

"۱۹۳۶ء کے الیکشن کے سلسلے میں جب کہ "مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ" کی تشکیل عمل میں آئی تو ہم لوگ اس بورڈ میں صرف اس توقع پر داخل ہوئے تھے کہ یہ جماعت آزاد خیال افراد پر مبنی ہوگی اور اس کی تمام تر کوشش اور مساعی آزادئ وطن اور رجعت پسند طبقہ کو زیر کرنے کے لیے ہوگی چنانچہ صاف اور واضح الفاظ میں مسٹر محمد علی جناح نے اس بات کا وعدہ کیا اور ہر طرح جماعت علماء کو اس بات کا اطمینان دلایا اور بڑی حد تک الیکشن کے زمانہ میں اس وعدہ کی پابندی بھی کی گئی لیکن الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہی جناح صاحب نے نہ معلوم کن مخفی وجوہ کی بنا پر اپنی روش بدل دی اور باوجود ہماری زبردست مخالفتوں کے انہوں نے اس رجعت پسند طبقہ کو شامل کرنا چاہا اور اس مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو جو مسلم لیگ جمعیۃ العلمائے ہند، مجلس احرار اور کانگرس کے ممبران سے ترکیب دیا گیا

تھا۔ کانگریس کے مدِ مقابل بنانے کی انتہائی کوشش کی اور کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت کہنا شروع کر دیا۔ جب ہم نے اس معاملہ میں احتجاج کیا اور جناح صاحب کو ان کے مواعید یاد دلائے اور بتایا کہ جماعتِ علماء بورڈ میں صرف اس بنا پر داخل ہوئی تھی کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آزادیِ وطن کے لیے کوشش کی جائے گی اور رجعت پسند طبقہ (یعنی وہ مسلمان جو کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک کر دینے کے خلاف ہیں) کو ایک ایک کر کے علیحدہ کر دیا جائے گا اور یہ صرف آزاد خیال لوگوں کی جماعت رہے گی۔ آپ رجعت پسندوں کو اس میں داخل کر رہے ہیں اور کانگریس کے ساتھ بجائے اشتراکِ عمل اور اتحادِ عمل کے مخالف جا رہے ہیں۔ تب جناح صاحب نے اور بعض دیگر لوگوں نے ہتک آمیز رویہ اختیار کیا اور کہا علماء کی شرکت اور مساعی سے ہم کو الیکشن میں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ ہمارے مینوفسٹو کی وجہ سے ہم کو کامیابی ہوئی تھی۔ اگر ہماری جماعتِ علماء اس طرزِ عمل کو پسند نہ کرے تو ہمیں مطلق اس کی پرواہ نہیں اسی قسم کی اور باتیں بھی کہی گئیں۔ [۶۰]

مولوی حسین احمد صاحب نے خود جو بیان دیا وہ بھی پورے کا پورا ملاحظہ ہو:

"وہ خطاب یافتہ اور پنشن پانے والے حضرات جن کا فرض اصلی برطانیہ کی نمک خواری اور اس کا راگ گاتے رہنا تھا اور وہ ملازمت پیشہ حضرات اور ان کے اقارب و اعزہ جن کا دین مذہب برطانیہ ہی تھا۔ سب کے سب فوجاً فوجاً جوق در جوق لیگ میں داخل ہو گئے اور مسٹر جناح کے کارگر بن گئے۔ لیگ کے مراکز سے نہ صرف

---

[۶۰] "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اس کا حل" مرتبہ مولوی حسین احمد صاحب ناشر جمعیتہ العلمائے ہند ۱۳۶۵ھ ص ۲۵-۲۶

تفرقہ اندازی کی بلکہ دہشت انگیزی اور دشنام طرازی۔ افترا پردازی اور بدطرازی کی بھی لپٹیں اٹھنے اور چنگاریاں مشتعل ہونے لگیں۔ جدھر دیکھو اُدھر مسٹر جناح اور اُن کے نئے نئے اتباع مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا آزاد سبحانی۔ مولانا مظہر الدین صاحب۔ مدیران انقلاب و احسان۔ مولانا اکرم خاں صاحب وغیرہ وغیرہ نے ایسی پلٹی کھائی کہ ان کی شرربار تقریروں اور تحریروں سے فضائے ہندوستان انتہائی مسمومیت کے دلدل میں پھنس کر رہ گئی۔ مسٹر محمد علی جناح اور اُن کی پارٹی جو ۱۹۳۴ء کے الیکشن کے بعد سے مرکزی اسمبلی میں کانگرس کے ساتھ ہو کر برابر دو سال تک گورنمنٹ کو شکستوں پر شکستیں دے رہے تھے اور جو کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاسِ مسلم لیگ بمبئی اور پارلیمنٹری بورڈ کے مینوفسٹو اور پروگرام وغیرہ کی بنا پر کانگرس کے بالکل قریب تر آ گئے تھے۔ یک بارگی ایسے پلٹے کہ الامان والحفیظ۔ لکھنؤ کے اجلاس کا سارا خطبہ کانگرس کی مذمتوں اور اس پر تنقیدات سے بھر دیا گیا"۔ ع۶۱

مندرجہ بالا ہر دو بیانات سے صاف واضح ہے کہ مولوی صاحب اور اُن کے ساتھی تھے۔ تو مسلم لیگ کے ساتھ لیکن اُن کی دلی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ تھیں۔ کسی نے سچ کہا ہے "روندی دُکھ یاراں دے نوں لے لے ناں بھراواں دا"
اسی زمانہ میں جناب محمد علی جناح صاحب کو ملّی اور سیاسی خدمات کی بنا پر

ع۶۱ "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل"، مرتبہ مولوی حسین احمد صاحب ناشر جمعیۃ العلمائے ہند ۱۳۶۵ھ ص ۲۸ - ۲۹

قوم کی طرف سے "قائدِ اعظم" کا خطاب دیا گیا تو مولانا نے اس خطاب کا بدیں الفاظ اپنے مولویانہ اور مفتیانہ انداز میں مذاق اُڑایا۔

"باوجودیکہ مسٹر جناح اسلام اور اہلِ سنّت اور اہلِ مذہب سے نہ صرف مستغنی بلکہ سخت متنفر بھی ہیں۔ نہ اُن کی زندگی مذہبی ہے نہ اس بے چارہ نے مذہبی ہونے یا مذہبی قیادت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہیں اور سیاسی قیادت کے مدعی اور خواہش مند ہیں اور پھر سیاست بھی اس قسم کی جو کہ یورپین اقوام اور ممالک کی ہے۔ اسلامی سیاست سے نہ واقف ہیں نہ اس کے مدعی۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ اصحابِ اغراض عام مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے امام اور "قائدِ اعظم" ہیں ان کی امامت اور قیادت پر اجماعِ اُمت منعقد ہو گیا ہے۔" ع۶۲

اب آئیے مولوی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی ہوسِ زر کی طرف۔ تحریکِ پاکستان کے مشہور رہنما جناب ایم۔ ایچ اصفہانی اپنی کتاب "قائدِ اعظم میری نظر میں" میں مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی مسلم لیگ سے علیحدگی کی داستاں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ لاہور کے جلسہ کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے تعجب بھی ہوا اور سخت رنج بھی۔ پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے کے دوران کئی تقریریں

ع۶۲ "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل" مرتبہ حسین احمد ناشر ناظم جمعیۃ العلمائے ہند ۱۳۶۵ھ ص ۲۵

ہوئیں۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولوی حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کی اس تحریک پر کہ مسلم لیگ کو زندہ سیاست کے اکھاڑے میں لایا جائے خوشنودی کا اظہار کیا۔ لیکن آخری روز ان دو عالموں میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ چوں کہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے مؤثر اور مسلسل پراپیگنڈہ کی ضرورت ہوگی لہٰذا دیوبند اپنے تمام ذرائع لیگ کی خدمت میں پیش کر دے گا بشرطیکہ پراپیگنڈہ کا خرچ لیگ برداشت کرے۔ اندازہ لگایا گیا کہ شروع میں کوئی پچاس ہزار روپے درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت لیگ کے صندوقچے میں تو پچاس تانبے کے سکّے بھی نہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری جو دونوں اعزازی تھے اپنے دفتر اپنے تھیلوں میں اٹھائے پھرتے تھے۔ مولانا کو مسلم لیگ کی مالی حالت کا علم سے جو لوگ جلسے میں حاضر تھے ان میں بیشتر کی نسبت زیادہ اچھی طرح تھا اس لیے وہ اپنی اس تجویز کے جواب کے متوقع بھی ضرور ہوں گے جو ظاہر ہے کہ کیا دیا جا سکتا تھا۔ مسٹر جناح کو انہیں بتانا پڑا کہ ایسی رقم موجود نہ تھی اور نہ ہی انہیں یہ اُمید تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اتنا روپیہ جمع کر سکیں گے۔ انہوں نے سب سے التجا کی کہ وہ جو بھی ذرائع خود فراہم کر سکیں اُن سے کام لیں اور کوئی ٹھوس نتائج پیدا کر کے دکھائیں۔ انہوں نے کہا اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہم سچے دل سے ان کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں تو روپیہ بلاشبہ ضرور مل جائے گا۔ لیکن ہم پہلے کام کر کے تو دکھائیں۔ جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے پاس کوئی روپیہ نہ تھا لہٰذا مسٹر محمد علی جناح مولانا کی

یہ پیش کش منظور نہ کر سکے کہ ''مالی امداد کی شرط پر وہ (یعنی مولوی صاحب) دار العلوم دیوبند کے تمام ذرائع ان کے لیے وقف کر دیں گے''۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؤں کو اس سے مایوسی ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ ہندو کانگریس کی طرف ڈھلتے گئے اور کانگرس پارٹی کے لیے پرچار کرنے لگے جو ظاہر ہے کہ ان کے مالی تقاضے پورے کر سکتی تھی''۔ ع۶۳

اب آخر میں ہم مولوی عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کا ایک واقعہ بیان کر کے اس داستان کو ختم کرتے ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ سبھی کانگرسی اور احراری علماء ہوسِ زر میں مبتلا تھے اور برلاؤں اور ٹاٹاؤں کے متلاشی تھے۔ ملاحظہ ہو۔
شورش کشمیری صاحب راوی ہیں کہ ''ایک دفعہ دورانِ تقریر شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا ''شاہ جی جناح سے آپ کا کیا اختلاف ہے''۔ فرمایا ''کوئی نہیں''۔ وہ ''تو پھر ایک کیوں نہیں ہو جاتے''۔

شاہ جی ''بھئی میں تو ان کی کفش برداری کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میرے ذہن میں بعض کانٹے ہیں وہ (قائدِ اعظم) یاد فرمائیں میں سر کے بل جاؤں گا۔ سمجھا دیا تو آرام سے بیٹھیں اُن کی لڑائی خود لڑوں گا۔ لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرتے صرف بیعت چاہتے ہیں''۔ مجمع دیہاتی تھا، قائدِ اعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ؎

میری گھگھری نوں گھنگھرو لوا دے
جے نوں میری ٹور دیکھنی''، ع۶۴

دیکھا آپ نے کہ اس واقعہ کا راوی کوئی ایرا غیرا نہیں بلکہ شاہ صاحب کا ایک غالی عقیدت مند اور مشہور ادیب شورش کشمیری ہے۔

ع۶۳ ''قائدِ اعظم میری نظر میں''، از اصفہانی شاہکار ایڈیشن لاہور جنوری ۱۹۷۶ء ص ۱۰

ع۶۴ ''عطاء اللہ شاہ بخاری''، مرتبہ شورش کشمیری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۲۸۹

حوالہ جات

ع۱ "مکتوبات شیخ الاسلام" جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں ص ۵۶۹

ع۲ "ینگ انڈیا" ۲۸ جولائی ۱۹۲۱ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ حبیب احمد چودھری ص ۱۹۲

ع۳ "ہریجن" ۶ / جون ۱۹۴۷ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۹۵

ع۴ "ینگ انڈیا" ۶ / اکتوبر ۱۹۲۱ء بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۹۶

ع۵ رسالہ "جامعہ" دہلی جولائی ۱۹۳۶ء ص ۶۸۵

ع۶ "میری کہانی" آپ بیتی جواہر لال نہرو" ص ۳۳۱ بحوالہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مولانا مودودی ص ۴۴

ع۷ خطبہ صدارت آل انڈیا نیشنل کانفرنس پنڈت نہرو بحوالہ سیاسی کشمکش حصہ دوم ص ۴۷

ع۸ میری کہانی جواہر لال نہرو۔ بحوالہ سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مولانا مودودی ص ۴۶

ع۹ میری کہانی جواہر لال نہرو " " " " " ص ۵۶

ع۱۰ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول مرتبہ مولانا مودودی بار چہارم ص ۱۸/۱۹

ع۱۱ شیرِ پنجاب لاہور ۱۹ ستمبر ۱۹۲۲ء بحوالہ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی مرتبہ منشی عبدالرحمٰن خاں ص ۳۳

ع۱۲ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی بار اول ص ۲۶۲/۲۶۳

ع۱۳ اقبال کے حضور " " ص ۲۶۹

ع۱۴ "انصاری"، دہلی ۲ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ بحوالہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم ص ۱۸/۱۹

ع۱۵ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم مرتبہ مودودی ص ۱۹

ع۱۶ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی ص ۱۲۵/۱۲۶

ع۱۷ " " " " ص ۱۲۶

ع۱۸ مکتوبات شیخ الاسلام بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۲۷۲/۲۷۳

ع۱۹ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مرتبہ چوہدری حبیب احمد ص ۲۷۱/۲۷۲

ع۲۰ ماہنامہ "حقیقت اسلام" لاہور ستمبر ۱۹۳۸ء ص ۲/۳

ع۲۱ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۰۷

ع۲۲ متحدہ قومیت اور اسلام مطبوعہ لاہور ص ۶-۵

ع۲۳ " " " " ص ۹-۸

ع۲۴ اقبال کے حضور مرتبہ سید نذیر نیازی مطبوعہ لاہور ص ۲۱۰

ع۲۵ ایضاً ص ۲۱۰

ع۲۶ ایضاً ص ۲۱۷

ع۲۷ ایضاً ص ۲۲۰

ع۲۸ ایضاً ص ۲۲۰/۲۲۱

ع۲۹ ایضاً ص ۲۴۷

ع۳۰ ایضاً ص ۲۴۷

ع۳۱ ایضاً ص ۲۳۱

ع۳۲ اقبال کا سیاسی کارنامہ مرتبہ محمد احمد خاں مطبوعہ لاہور ص ۵۹۵

عـ۳۳ محمد علی جناح مرتبہ عبدالعزیز بی - ایس سی مطبوعہ بمبئی ص ۴۶ - ۴۴

عـ۳۴ ایضاً ص ۴۷ - ۴۶

عـ۳۵ ایضاً ص ۵۱ - ۵۰

عـ۳۶ ایضاً ص ۵۲ - ۵۱

عـ۳۷ ایضاً ص ۵۸ - ۵۶

عـ۳۸ ایضاً ص ۶۱

عـ۳۹ ایضاً ص ۵۸

عـ۴۰ متحدہ قومیت اور اسلام مرتبہ مولوی حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۱۵-۱۴

عـ۴۱ ایضاً ص ۱۶

عـ۴۲ ایضاً ص ۱۸-۱۷

عـ۴۳ ایضاً ص ۲۲-۲۱

عـ۴۴ ایضاً ص ۲۰

عـ۴۵ "متحدہ قومیت اور اسلام" مرتبہ مولوی حسین احمد صاحب مطبوعہ لاہور ص ۲۴-۲۳

عـ۴۶ ایضاً ص ۳۰

عـ۴۷ ایضاً ص ۲۸

عـ۴۸ ایضاً ص ۳۱-۳۰

عـ۴۹ ایضاً ص ۷۶

عـ۵۰ ایضاً ص ۹۰

عـ۵۱ ایضاً ص ۹۲

عـ۵۲ "متحدہ قومیت اور اسلام" مرتبہ مولانا رازی صاحب مطبوعہ لاہور ص ۴ - ۵

ع۵۳ "مسئلہ قومیت" مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی بار اوّل مطبوعہ لاہور
ص ۶۴ تا ۶۶

ع۵۴ "تاثرات و تصورات" از عبدالوحید خاں مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء
ص ۲۶۷ - ۲۶۸

ع۵۵ ایضاً ص ۲۶۸ - ۲۶۹

ع۵۶ ایضاً ص ۲۷۴

ع۵۷ ایضاً ص ۲۷۴ تا ۲۷۶

ع۵۸ "پاکستان کیا ہے" از مولوی مدنی مطبوعہ دہلی ۱۳۶۵ھ ص ۱۱

ع۵۹ "متحدہ قومیت اور اسلام" مرتبہ مولوی حسین احمد مطبوعہ لاہور ص ۲۲

ع۶۰ "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل" مرتبہ مولوی مدنی مطبوعہ دہلی
۱۳۶۵ھ ص ۲۵ - ۲۶

ع۶۱ "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل" مرتبہ مولوی مدنی مطبوعہ دہلی
۱۳۶۵ھ ص ۲۸ - ۲۹

ع۶۲ "مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل" مرتبہ مولوی مدنی مطبوعہ دہلی
۱۳۶۵ھ ص ۳۵

ع۶۳ "قائدِ اعظم میری نظر میں" مرتبہ ایم - ایچ اصفہانی شاہکار سلسلہ لاہور
جنوری ۱۹۷۷ء ص ۱۰

ع۶۴ عطاء اللہ شاہ بخاری مرتبہ شورش کشمیری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۲۸۹

کتابیات

اقبال، سر محمد

مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان، ۱۹۵۴ء مطبوعہ لاہور

چوہدری، حبیب احمد

تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، ۱۹۶۶ء مطبوعہ لاہور

خورشید، عبد السلام

سرگذشتِ اقبال، ۱۹۷۷ء مطبوعہ لاہور

رضیہ، فرحت بانو

خطباتِ اقبال، ۱۹۴۶ء مطبوعہ دہلی

رازی، مولانا: متحدہ قومیت اور اسلام، ۱۹۷۸ء مطبوعہ لاہور

عبد الشکور، پروفیسر

حسرت موہانی، ۱۹۴۶ء مطبوعہ آگرہ

عبد العزیز بی۔ ایس۔ سی

محمد علی جناح، ۱۹۳۹ء مطبوعہ بمبئی

عبد الوحید خاں

تاثرات و تصورات، ۱۹۶۰ء مطبوعہ لاہور

عبد الرحمن منشی

تحریکِ پاکستان اور علمائے ربانی ۱۹۵۶ء ناشر ادارہ نشر المعارف ملتان

فقیر، سید وحید الدین

روزگارِ فقیر جلد دوم، ۱۹۶۰ء مطبوعہ کراچی

قریشی، احمد حسین احمد

من کیستم، ۱۹۷۲ء مطبوعہ کراچی

کشمیری، شورش

عطاء اللہ شاہ بخاری، ۱۹۷۳ء مطبوعہ لاہور

مودودی، سید ابوالاعلیٰ

مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اول، ۱۹۴۲ء مطبوعہ لاہور

مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ دوم، ۱۹۴۲ء مطبوعہ لاہور

مسئلہ قومیت، سن ندارد مطبوعہ لاہور

ایم۔ ایچ اصفہانی

قائدِ اعظم میری نظر میں ۱۹۷۶ء مطبوعہ لاہور

مولانا، حسین احمد دیوبندی

متحدہ قومیت اور اسلام، ۱۹۷۵ء مطبوعہ لاہور

پاکستان کیا ہے، ۱۳۶۵ھ، ناشر مکتبہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی

مسٹر جناح کا پُر اسرار معمہ اور اُس کا حل، ۱۳۶۵ھ، ناشر مکتبہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی

مولانا، سید سلیمان اشرف

النور، ۱۹۲۱ء، مطبوعہ علی گڑھ

محمود نظامی

ملفوظاتِ اقبال، ۱۹۴۵ء، مطبوعہ لاہور

نیازی، سید نذیر

اقبال کے حضور، ۱۹۷۱ء مطبوعہ کراچی

یامین نواب سر محمد

اعمال نامہ جلد اوّل ۱۹۷۰ء مطبوعہ لاہور

رسائل و اخبارات

"جامعہ" دہلی جولائی ۱۹۳۶ء

"ترجمانِ حقیقت" لاہور ستمبر ۱۹۳۸ء

"نقوش" لاہور ع ۱۲۳ اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

"ادبی دنیا" لاہور اکتوبر ۱۹۵۰ء

"اقبال" لاہور اکتوبر ۱۹۵۷ء

"THE MINARET" کراچی جولائی ۱۹۷۴ء

روزنامہ "جنگ" راولپنڈی اقبال نمبر اپریل ۱۹۶۸ء

تحریکِ آزادیٔ ہند

اور

السّوادِ الاعظم

مصنف

پروفیسر محمد مسعود احمد

علمائے اہلسنت وجماعت

بالخصوص مولٰنا محمد نعیم الدین مرادآبادی اور مفتی محمد عُمر نعیمی

کے سیاسی ومذہبی افکار وخیالات

نیز تحریکِ پاکستان میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس اور

صحافتی اور عوامی سطح پر ان حضرات کی

قابل قدر خدمات کا تحقیقی جائزہ

رضا پبلی کیشنز مین بازار داتا دربار لاہور